سفرنامہ جنوبی افریقہ

(تاریخ، تعارف اور تأثرات)

از

(مولانا) حذیفہ ابن حضرت مولانا غلام محمد وستانوی صاحب

(معتمد جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا)

ناشر

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم

اکل کوا، نندوربار، مہاراشٹر ۴۲۵۴۱۵

کتاب کے بارے میں اکابرین کے تاثرات

قدیم زمانہ سے اہلِ علم وفضل جب اپنے ملک سے باہر سفر کرتے ہیں تو اپنے تاثرات اور نئے ملک کے باشندوں، وہاں کی تہذیب وثقافت اور طرزِ حکومت وغیرہ امور کا ذکر اپنے سفر ناموں میں لکھتے ہیں۔ سفر کے معنی ہی واضح ہونا، کھلنا اور اجالا ہونا ہے۔ حدیث پاک میں ارشاد ہے: اسفروا بالفجر فجر کو روشن ہونے پر پڑھو اور بے حجاب عورتوں کو "نساء سافرات" کہا جاتا ہے

سفر میں انسان کے لیے نئی نئی معلومات اور بہت سے انکشافات ہوتے ہیں اور بہت سے حالات وواقعات سے آدمی کو واسطہ پڑتا ہے۔

قرآن میں {سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ} فرما کر سفر سے پچھلی قوموں کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کا حکم دیا ہے

(مفکر اسلام مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی رحمۃ اللہ علیہ)

ایسا سفر نامہ جو کسی عالم وفاضل کے قلم سے معرضِ وجود میں آیا ہو، تو اس کے فقرہ فقرہ سے علم وآگہی، ایجاد وانکشاف، حقائق واسرار، تجربات ومشاہدات اور عبر وحِکم نمایاں ہوتے ہیں۔

(غلام محمد صاحب وستانوی)

سفر نامے انسانی زندگی کے خطوط صحیح کرنے، ملکوں، قوموں اور سماجوں کی ترقی وتنزُّلی کے اسباب وعوامل کو جاننے، زبان وادب کو سلیقہ بخشنے، علمی ذوق اور فکری صواب کو پروان چڑھانے میں انتہائی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، بالخصوص! اس وقت جب کہ وہ سفر نامہ کسی ایسی ذات وشخصیت کا ہو، جس نے دینی وفکری گھرانے میں آنکھیں کھولی ہو، مرجعِ خلق ہستی کی اولاد میں ہو، اور اس مقدس شخصیت نے قدم قدم پر اپنی اس اولاد کی بہتر سے بہتر تربیت فرما کر اسے اپنا سچا جانشین بنانے میں اَن تھک محنت وکوشش کی ہو، اسے زیورِ علم وادب سے مزین ومہذب کیا ہو، علم وعلما کی قدردانی سکھائی ہو، لکھنے پڑھنے کا شوق ولگن اس میں پیدا کیا ہو، اپنی سرپرستی میں دینی ودنیوی سوجھ بوجھ عطا کی ہو، اور کسی بڑے مرکزی دینی وعصری ادارے کی سربراہی واُمور کی انجام دہی کے لیے اس پر اعتماد کر کے اسے اپنا معتمد قرار دیا ہو، تو ایسی شخصیت کا سفر نامہ واقعی سفر نامہ ہوگا، جس سے جہاں انسانی زندگیوں کے خطوط صحیح کرنے میں مدد ملے گی، وہیں ملکوں، قوموں اور سماجوں کے ترقی وتنزُّلی کے اسباب وعوامل کا علم اور نتائج وعبرتوں کا اِدراک ہوگا۔

(مفتی محمد جعفر صاحب ملی رحمانی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سفرنامۂ جنوبی افریقہ

تاریخ، تعارف اور تاثرات

از

(مولانا) حذیفہ ابن حضرت مولانا غلام محمد وستانوی صاحب

معتمد جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا

ناشر

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، نندوربار (مہاراشٹر)

1

تفصیلات

نام کتاب : جنوبی افریقہ، تاریخ، تعارف اور تاثرات

کاوش : مولانا حذیفہ ابن حضرت مولانا غلام محمد وستانوی صاحب

کمپوزنگ وسیٹنگ : محمد سبحان ارریاوی اشاعتی (9422849645)

ناشر : جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، نندوربار

صفحات : ۲۲۶

قیمت :

برائے رابطہ:

مولانا حذیفہ صاحب وستانوی +91-9423183860

مفتی محمد ہلال الدین صاحب ابراہیمی +91-8411801380

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، نندوربار، مہاراشٹر (انڈیا)

فہرست عناوین

2

3

4

کلماتِ تبریک

حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی دامت برکاتہم

(رئیس جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ !

قَالَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ : ﴿قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾(سورۃ الانعام: ۱۱)

قرآن پاک میں انسان کو سفر کی دعوت دی گئی، تاکہ وہ دیگر ملکوں میں بسنے والے انسانوں کی تہذیب وثقافت افکار وخیالات، عقائد و مذاہب، ترقی وتباہی کو دیکھ کر اپنے لیے سامانِ عبرت ونصیحت حاصل کریں۔ اور اپنی حیات کے خطوط کو صحیح ودرست کرلیں۔

کتابوں کی دنیا میں سفر ناموں کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے، کیوں کہ سفر نامے نادیدکو دیدنی بنادیتے ہیں۔ کسی آدمی نے کوئی سفر نہ کیا ہو، لیکن اگر اس نے سفر ناموں کا بغور مطالعہ کیا ہو تو وہ متعلقہ ممالک کا جغرافیہ، وہاں بسنے والے لوگوں کے عقائد و مذاہب، تعلیم وتجارت اور تہذیب وتمدن سے پوری طرح واقف ہوتا ہے۔ اور سفر ناموں کا مطالعہ اس کی شخصیت سازی، فکری بالیدگی، ذہنی وعقلی ارتقا کا

اہم ترین سبب قرار پاتا ہے۔ بالخصوص ایسا سفر نامہ جو کسی عالم و فاضل کے قلم سے معرضِ وجود میں آیا ہو، تو اس کے فقرہ فقرہ سے علم وآ گہی، ایجاد وانکشاف، حقائق و اسرار، تجربات ومشاہدات اور عبر وحِکَم نمایاں ہوتے ہیں۔ اور اس کا قلم پورے سفر کی وہ عکاسی وترجمانی کرتا ہے کہ قاری اپنے آپ کو مصنف کا ہم سفر وہم رکاب محسوس کرتا ہے۔ اور اپنے ذوق وخیال کے مطابق اس سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

اسی طرح کا ایک سفر نامہ ''جنوبی افریقہ تاریخ، تعارف اور تاثرات'' کے نام سے منصۂ شہود پر آنے جارہا ہے؛ جسے عزیزم، لختِ جگر، نورِ نظر، معتمد جامعہ مولانا حذیفہ صاحب وستانوی سلمہ نے مرتب فرمایا ہے۔ الحمدللہ! اللہ پاک نے موصوف کو کتاب وسنت کی تعلیم وتحقیق، دینی وعصری اداروں کی تنظیم وترتیب کا خوب ذوقِ سلیم عطا فرمایا ہے۔ جس پر ان کی تحریریں، تقریریں اور روزمرہ کے مشاغل شاہد عدل ہیں۔ اس لیے امید ہے کہ آپ کا یہ سفر نامہ بھی حقائق کشاں، بصیرت افروز، اور شائقینِ مطالعہ کے لیے باعثِ تسکین وطمانینت ثابت ہوگا۔

دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے اسے قبول عام عطا فرمائے اور موصوف کی تمام دینی خدمات واعمال کو اپنے ہاں شرفِ قبولیت سے نواز کر اپنی رضا نصیب فرمائے۔ آمین! فقط

غلام محمد وستانوی

۵/محرم الحرام ۱۴۴۱ھ

تقــريــظ

مولانا عبداللہ (صاحب) کاپودروی
(رئیس مدارسِ گجرات وسرپرست جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا)

قدیم زمانہ سے اہلِ علم وفضل جب اپنے ملک سے باہر سفر کرتے ہیں تو اپنے تاثرات اور نئے ملک کے باشندوں، وہاں کی تہذیب وثقافت اور طرزِ حکومت وغیرہ امور کا ذکر اپنے سفرناموں میں لکھتے ہیں۔

چینی سیاحوں اور عرب سیاحوں کے سفرناموں سے بہت سی تاریخی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ ابن حوقل، ابن جبیر، ابن بطوطہ کے سفرنامے بہت مشہور ہیں۔ خصوصاً سفرنامہ ابن بطوطہ جو اصل عربی میں '' رحلة ابن بطوطه'' کے نام سے شائع ہوا تھا، کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح ہمارے دور میں علامہ شبلی کا سفرنامہ '' روم ومصر وشام''، مولانا مسعود عالم ندوی کا سفرنامہ '' دیارِ عرب میں چند ماہ'' مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا سفرنامہ۔ '' مذاکرات'' اور اس کا اردو ترجمہ '' شرقِ اوسط کی ڈائری'' مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ کا سفرنامہ '' سیاحتِ ماجدی'' شیخ الاسلام مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ کے سفرنامے '' جہانِ دیدہ'' اور '' دنیا میرے آگے'' حکیم سعید دہلوی کے سفرنامے '' سفر در سفر'' اور مشہور عرب مصنفین شیخ عبدوی اور محمد المجذوب کے سفرنامے کافی معلومات افزا اور مقبول ہیں۔

سفر کے معنی ہی واضح ہونا، کھلنا اور اجالا ہونا ہے۔ حدیث پاک میں ارشاد ہے: '' اسفروا بالفجر'' فجر کو روشن ہونے پر پڑھو۔ اور بے حجاب عورتوں کو '' نساء سافرات'' کہا جاتا ہے۔

سفر میں انسان کے لیے نئی نئی معلومات اور بہت سے انکشافات ہوتے ہیں اور بہت سے حالات وواقعات سے آدمی کو واسطہ پڑتا ہے۔

قرآن میں ﴿سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾ فرماکر سفر سے پچھلی قوموں کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کا حکم دیا ہے۔

اسی سلسلے کا ایک سفرنامہ ہمارے سامنے ہے، جس کو مولانا حذیفہ بن مولانا غلام محمد صاحب وستانوی فلاحی نے مرتب فرمایا ہے۔ جس میں جنوبی افریقہ کے اپنے سفر کی روداد آسان زبان میں لکھی ہے۔ جنوبی افریقہ کے بارے میں بہت سی معلومات اور وہاں کے دینی اور رفاہی اداروں، ریڈیو اسلام اور اس کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔

امید ہے کہ اس سفرنامہ سے شائقین کو جنوبی افریقہ کے بارے میں دل چسپ معلومات حاصل ہوگی۔

مولانا حذیفہ وستانوی سلمہ مطالعہ کے شوقین اور علمی مزاج رکھتے ہیں۔ اس لیے امید ہے کہ آئندہ بھی اُن کے قلم سے مفید کتابیں آتی رہیں گی۔ ان شاءاللہ۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو مزید ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

والسلام

احقر (مولانا) عبداللہ (صاحب) غفرلہ کاپودروی

ربیع الاول ۱۴۳۹ھ

تقریظ

مفتی محمد جعفر صاحب ملی رحمانی

(استاذ فقہ وافتا وصدر مفتی جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا)

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسوله الکریم ، أما بعد :

قال اللّٰہ تبارک وتعالی : ﴿قل سیروا في الارض ثم انظروا کیف کان عاقبة المکذبین﴾ . (سورة الأنعام : ۱۱)

﴿قل سیروا في الارض فانظروا کیف کان عاقبة المجرمین﴾ . (سورة النمل : ۶۹)

وعن أبي هریرة أن النبي ﷺ قال : " سافروا تصحوا ، واغزوا تستغنوا " . (مسند أحمد)

کسی شخص کا اپنے وطن کو چھوڑ کر کسی اور مقام کی طرف منتقل ہونا، خواہ یہ انتقال قصیر ہو یا طویل، عرف وعادت میں سفر کہلاتا ہے، جب کہ شرعاً سفر وہی انتقال کہلائے گا جس کی مسافت ساڑھے ستہتر کلومیٹر یا اس سے زائد ہو۔

" أقل سفر تتغیر به الأحکام مسیرة ثلاثة أیام من أقصر أیام السنة بسیر وسط مع الاستراحات " (نور الإیضاح)

سفر کے مختلف اسباب ہوتے ہیں، سیاحت، طلبِ علم، تجارت، علاج ومعالجہ، زیارتِ اقارب، عباداتِ دینیہ کی ادائیگی، مختلف ثقافتوں سے آگہی، قومی، ملکی کانفرسوں اور جلسوں میں شرکت وحاضری وغیرہ، جن سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مقاصدِ سفر جس قدر اہم ہوں گے، اسی قدر سفر بھی اہم ہوگا، اور اسی کے مطابق اس کا حکم بھی ہوگا،

جیسا کہ فقہ کا قاعدہ ہے: "حکم الوسائل حکم المقاصد" - اسباب وسائل کا حکم وہی ہوتا ہے جو ان کے مقاصد کا ہے۔ مقصد سفر امرِ مباح ہو، مقاصدِ شرعیہ سے متصادم نہ ہو، تو اس طرح کا سفر بہ نگاہِ شرع محمود وپسندیدہ ہے، جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے:

﴿هو الذي جعل لکم الارض ذلولا فامشوا في مناکبها وکلوا من رزقه والیه النشور﴾ "وہ وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے مسخر کردیا، سوتم اُس کے راستوں میں چلو پھرو، اور اللہ کی دی ہوئی روزی میں سے کھاؤ پیو اور اسی کے پاس زندہ ہوکر جانا ہے"۔ (سورۃ الملک:۱۵)

مسافر اپنے سفر کے دوران جن چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے، اُن کے مشاہدے کو، جن افراد سے زیارت وملاقات کرتا ہے، اُن کی زیارت وملاقات کو، جن ملکوں کی ثقافتوں سے واقف ہوتا ہے، اُن کی واقفیت کو، جن ترقی یافتہ یا تباہ شدہ قوموں کو دیکھتا ہے، اُن کے اسبابِ ترقی وتباہی کو، جس نسلِ نو اور اُن کے مشاغل سے واقف ہوتا ہے، اُن کے حال ومستقبل کے خوش آئند یا تباہ کن ہونے کو- الفاظ کا جامہ پہنا کر جن صفحات وقرطاس کے سپرد کرتا ہے اُنہیں "سفرنامہ" کہا جاتا ہے۔

سفرنامے انسانی زندگی کے خطوط صحیح کرنے، ملکوں، قوموں اور سماجوں کی ترقی وتنزُّلی کے اسباب وعوامل کو جاننے، زبان وادب کو سلیقہ بخشنے، علمی ذوق اور فکری صواب کو پروان چڑھانے میں انتہائی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، بالخصوص! اس وقت جب کہ وہ سفرنامہ کسی ایسی ذات وشخصیت کا ہو، جس نے دینی وفکری گھرانے میں آنکھیں کھولی ہو، مرجعِ خلق ہستی کی اولاد میں ہو، اور اس مقدس شخصیت نے قدم قدم پر اپنی اس اولاد کی بہتر سے بہتر تربیت فرما کر اسے اپنا سچا جانشین بنانے میں اَن تھک محنت وکوشش کی ہو،

اسے زیورِ علم وادب سے مزین ومہذب کیا ہو، علم وعلما کی قدر دانی سکھائی ہو، لکھنے پڑھنے کا شوق ولگن اس میں پیدا کیا ہو، اپنی سرپرستی میں دینی ودنیوی سوجھ بوجھ عطا کی ہو، اور کسی بڑے مرکزی دینی وعصری ادارے کی سربراہی واُمور کی انجام دہی کے لیے اس پر اعتماد کرکے اسے اپنا معتمد قرار دیا ہو، تو ایسی شخصیت کا سفرنامہ واقعی سفرنامہ ہوگا، جس سے جہاں انسانی زندگیوں کے خطوط صحیح کرنے میں مدد ملے گی، وہیں ملکوں، قوموں اور سماجوں کے ترقی وتنزّلی کے اسباب وعوامل کا علم اور نتائج وعبرتوں کا اِدراک ہوگا۔ میری مراد زیرِنظر ''سفرنامۂ جنوبی افریقہ'' ہے، جو ایک عظیم بزرگ، عالمِ ربانی، میرے مربی؛ حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی مدظلہم العالی کے ولد صالح، راقم الحروف کے تلمیذ رشید، صدیق حمیم، ناظم تعلیمات ومعتمد جامعہ؛ مولانا حذیفہ صاحب وستانوی حفظہم اللہ تعالیٰ کا سفرنامہ ہے، جنہیں قسّامِ ازل نے بچپن سے ہی ذوقِ علم، قدردانئ اہلِ علم، زیارتِ مشائخ اور ان سے ربط، تقریر وتحریر، کچھ کرگزرنے کا حوصلہ وہمت، امتِ مسلمہ کی فکری بے راہ روی کا اِحساس اور اُن کی صحیح رہنمائی ورہبری کا جذبۂ خالصہ، سفر ہو یا حضر بہرحال اشتغال بالعلم والعمل، زیرِ تعلیم طلبہ کی تربیت وتہذیب کی فکر، ادارہ کی ترقی اور اسے بامِ عروج پر پہنچانے کی تدبیر وغیرہ جیسی اَن گنت بیش بہا نعمتوں سے سرفراز کیا ہے۔

آپ موصوف نے جنوبی افریقہ کا سفر اپنے بعض علم دوست احباب، اعزہ واقربا کی دعوت پر فرمایا تھا، اور آپ کا یہ سفر محض ایک سفر ثابت نہیں ہوا، بلکہ اس سفر کی وجہ سے بہت سے حقائق منکشف ہوئے، مثلاً: براعظم کا رقبہ، افریقی ممالک کا محملِ صحیح، ان ممالک میں آمدِ اسلام

کی تاریخ، وہاں بسنے والے مسلمانوں کے احوال، سیاہ فام وسفید فام لوگوں کی تاریخ، ان ملکوں میں موجود خدائی معدنیات اور اُن کا ظہور، ہجرتِ اُولیٰ کے لیے ملکِ حبشہ (جو جغرافیائی اعتبار سے افریقی ممالک میں داخل ہے) کا انتخاب کیوں؟ جنوبی افریقہ میں گجراتی مسلمانوں کی آمد، اُن کی سرگرمیاں، دینی تعلیمی درس گاہیں اور ملک پر ان کے مثبت اثرات وغیرہ۔

موصوف کی عادت ہے کہ اس طرح کے دینی وعلمی سفر پر روانہ ہونے سے پہلے طلبہ واساتذۂ جامعہ کو اس سے مطلع فرماتے ہیں، اور اس کی کامیابی کے لیے دعا کی درخواست بھی کرتے ہیں، پھر واپسی پر تقریراً وتحریراً مفید، پُر از حِکم وعِبر مُشاہدات وتأثُّرات طلبہ واساتذہ کے سامنے بیان فرماتے ہیں۔

''سفرنامۂ جنوبی افریقہ'' اسی سلسلۃ الذہب ایک انتہائی اہم ومفید کڑی ہے، جو قسط وار ماہ نامہ ''شاہ راہِ علم'' میں شائع ہوتا رہا، اور اب کتابی شکل میں بنام ''جنوبی افریقہ، تاریخ، تعارُف اور تأثرات'' منظرِ عام پر آنے جارہا ہے۔ امید ہے کہ اس کے مطالعے سے اس ملک کے احوال معلوم کرنے کا شوق رکھنے والوں کو کافی حد تک اطمینان بخش اور دل چسپ معلومات حاصل ہوں گی۔

اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ آپ عزیز کو صحت وتن درستی اور دوامِ عافیت بخش دے، اور تاحینِ حیات دین واہلِ دین کی خدمت کے لیے قبول فرماکر اپنی رضا نصیب فرمائے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین

محمد جعفر ملی رحمانی

۸؍محرم الحرام ۱۴۴۰ھ

باسمہ تعالیٰ

اللہ نے انسان کو ابتلا کے لیے پیدا کیا اور اس کی عقل کے مطابق ملکۂ تمیز عطا کیا۔ انسان ہر حال میں چیزوں کی حقیقتوں اور مخفی رازوں کو جاننے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، اسی وجہ سے ترقی بھی کرتا ہے، کیوں کہ راز پر راز منکشف ہوتے ہیں اور چیزیں وجود میں آتی ہیں، انہیں رازوں کا پردہ چاک کرنے کے لیے جہاں وہ دیگر اسباب اختیار کرتا ہے وہیں سفر بھی کرتا ہے؛ تا کہ دوسرے علاقوں کے احوال و آثار اس پر منکشف ہوں۔

گویا سفر کرنے کے مختلف اغراض ہوتے ہیں؛ مگر ایک غرض یہ بھی ہوتی ہے۔

قرآن کریم نے بھی انکشافِ احوال اور عبرت وموعظت کے لیے سفر کی تلقین کی ہے۔

﴿قُلْ سِيْرُوا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ﴾

(سورۃ النمل:۶۹)

سفر کے لغوی معنی:

(۱) سفر دراصل عربی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں ’’الکشف‘‘ یعنی واضح کرنا، کسی چیز کی حقیقت کو کھولنا۔

عربی میں کہتے ہیں ’’**سفرت الريح الغيم عن وجه السماء**‘‘

ہوا نے بادل کو آسمان پر سے ہٹا دیا۔

(۲): ’’**كشف ظاهر الشيء أو أعلاه بزوال ما يعروه أو يغشاه**‘‘۔

کسی چیز کے ظاہری یا اوپری حصہ کا اس طور پر کھولنا اور ظاہر کرنا کہ اس پر جو پردہ تھا وہ ہٹ جائے۔

(المعجم الاشتقاقي الموصل لألفاظ القرآن الكريم: ۱۰۲۳)

سفر کی اصطلاحی تعریف:

’’**مفارقة إرادية للمقر بابتعاد و استرسال**‘‘ اپنے ارادہ سے اپنے وطن اور مستقر سے جدا ہونا۔

حدیث میں ہے ’’**السفر قطعة من العذاب**‘‘(۱)

سفر گویا جہنم کا ایک ٹکڑا ہے، یعنی مشقت سے پُر ہے، لیکن اس کے فوائد اور ثمرات بہت عمدہ ہوتے ہیں، انسان کو تجربات حاصل ہوتے ہیں، معلومات میں اضافہ ہوتا ہے وغیرہ۔

سفر کی اسی مشقت کے پیشِ نظر اسلام نے بلا ضرورت سفر کرنے سے منع کیا ہے، جیسا کہ فقہا نے اس کی صراحت کی ہے۔

یوں تو احقر کو مختلف دینی وعلمی سفر پیش آتے رہتے ہیں، لیکن سفر نامہ لکھنے کا اہتمام نہیں رہا، کیوں کہ میری حیثیت ہی کیا کہ اپنے مشاہدات کو لکھ کر لوگوں تک پہنچاؤں، گرچہ اس سے قبل حیدرآباد کا ایک سفر نامہ لکھا تھا، اور حرمین کا سفر نامہ لکھنے کا ارادہ تو کافی عرصہ سے ہے؛ مگر موقع نہیں مل سکا، اب کی بار جب جنوبی افریقہ کا

---

(۱) بخاری شریف رقم الحدیث: ۱۸۰۴۔

سفر کیا تو دیکھا کہ ماشاء اللہ مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود اچھا اثر ورسوخ رکھتے ہیں اور اس کی وجہ ان کی اسلامی تعلیمات سے والہانہ وابستگی اور تجارت میں کلیدی کردار ہے، تو ارادہ کیا کہ کیوں نہ سفرنامۂ جنوبی افریقہ کے بہانہ دنیا میں موجود دسیوں نہیں سیکڑوں مسلمان اقلیتوں کو یہ نمونہ پیش کروں کہ جنوبی افریقہ کی مسلمان اقلیت ہمارے لیے اسوہ اور مشعلِ راہ ہے، پس اسی دینی جذبہ سے میں اس سفرنامہ کو تحریر کررہا ہوں، اللہ تعالیٰ صحیح لکھنے کی اور عبرت حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جنوبی افریقہ کے بارے میں مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کے تاثرات:

شیخ الاسلام مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم مسلمانانِ جنوبی افریقہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

’’کیپ ٹاؤن‘‘ کے پندرہ روزہ قیام میں جس قابلِ ذکر اور سبق آموز بات کا نقش دل پر قائم ہوا، وہ اس علاقے کے مسلمانوں کا پُر جوش دینی جذبہ ہے ’’کیپ ٹاؤن‘‘ کو جنوب میں دنیا کا آخری سرا سمجھنا چاہیے۔

اس دُور افتادہ علاقے میں جو صدیوں سے مغربی اقوام کے زیرِ تسلّط ہے اور جہاں قدم قدم پر بے دینی، عیش وعشرت اور عریانی وفحاشی کے محرکات شب وروز کارفرما ہیں، یہ مسلمان اپنی دینی روایات کو بڑی حد تک تھامے بیٹھے ہیں، اقلیت ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے دینی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے جان کی بازی لگائی ہوئی ہے اور جب کبھی کسی دینی مسئلے پر آنچ آتی ہے تو ان کا جذبۂ بیتاب قابلِ دید ہوتا ہے۔

اس مقدمے (کفرِ مرزائی) کے موقع پر بھی ملک کے تینوں صُوبوں ٹرانسوال، نٹال اور کیپ سے مسلمانوں کے نمائندے ’’کیپ ٹاؤن‘‘ میں جمع ہوگئے تھے اور ان میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا قابلِ رشک جذبہ کھُلی آنکھوں محسوس ہوتا تھا۔

ان حضرات نے خالص دینی جذبے کے تحت جس طرح پاکستانی وفد کے لیے دیدہ ودل فرشِ راہ کیے اور جس محبت اور گرم جوشی کا معاملہ کیا، وہ ہم میں سے ہر ایک کے لیے ایک ناقابلِ فراموش یادگار ہے۔

(جہانِ دیدہ: ص ۶،۷)

اتنی معمولی اقلیت میں ہونے کے باوجود جنوبی افریقہ کے مسلمانوں نے اپنا دینی تشخص جس باریک بینی سے محفوظ رکھا وہ قابل صد تعریف ہے، مجھے ایسے بہت سے ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، لیکن جنوبی افریقہ کے مسلمان دینی اعتبار سے دوسرے تمام ممالک کے مقابلے میں زیادہ منظّم، پُرجوش اور حساس نظر آئے، انہوں نے ملک کے طول وعرض میں شان دار مسجدیں تعمیر کیں، ایسی مسجدیں کہ ان میں داخل ہونے کے بعد کوئی بھی شخص اعلیٰ درجے کی صفائی، ستھرائی اور خوش سلیقگی کا تأثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا، ہر مسجد کے ساتھ بچوں کی دینی تعلیم کے لیے ایک معیاری مرکز قائم کیا، جہاں مسلمان بچے روزانہ شام کے وقت بنیادی دینی تعلیمات سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور مسلمان گھرانوں کا شاید کوئی بچہ ایسا نہ ہو جو زندگی کے کارزار میں داخل ہونے سے پہلے ان تعلیمی مراکز کی تربیت سے نہ گزرا ہو۔

اس کے علاوہ ان مسلمانوں نے اپنے بہت سے نوجوانوں کو اعلیٰ اسلامی علوم کی تحصیل کے لیے ہندوستان اور پاکستان کے بڑے دینی مدارس میں بھیجا، جو یہاں سے اسلامی علوم کی تکمیل کے بعد اپنے وطن پہنچے اور اب ان کی ایک بڑی کھیپ وہاں قابلِ قدر دینی خدمات انجام دے رہی ہے اور اب خود جنوبی افریقہ میں کئی معیاری دارالعلوم قائم ہیں، جہاں اسلامی علوم کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہے۔

(دنیا مرے آگے: ص ۱۳۲، ۱۳۳)

براعظم:

زمین کا ایک بڑا علاقہ جو عام خیال سے سمُندر سے گھرا ہوا ہے ''براعظم'' کہلاتا ہے۔اس تعریف کے مطابق سات براعظم ہیں:

(۱) ایشیا (۲) یورپ (۳) افریقہ (۴) انٹارکٹیکا (۵) آسٹریلیا (۶) شمالی امریکہ (۷) جنوبی امریکہ۔

مگر یہ خیال درست نہیں؛ کیوں کہ یورپ اور ایشیا، روس کے زمینی راستے سے جڑے ہوئے ہیں اس لیے پورے کو ایشیا کہنا چاہیے۔

اسی طرح جنوبی اور شمالی امریکہ بھی جڑے ہیں، یہی وجہ ہے کہ براعظم کی اصل تعداد پانچ سمجھی جاتی ہے، رقبہ اور آبادی دونوں لحاظ سے سب سے بڑا براعظم ایشیا ہے، مسلمانوں کی اکثریت ایشیا میں رہتی ہے، ساتوں براعظم مل کر زمین کا صرف ایک تہائی حصہ بنتے ہیں اور باقی حصہ سمندروں پر مشتمل ہے۔

براعظم بالترتیب باعتبار رقبہ:

(۱)......ایشیا/۴۳،۸۲۰،۰۰۰کلومیٹر۔

(۲)......افریقہ/۳۰،۳۷۰،۰۰۰کلومیٹر۔

(۳)......شمالی امریکہ/۲۴،۴۹۰،۰۰۰کلومیٹر۔

(۴)......جنوبی امریکہ/۱۷،۸۴۰،۰۰۰کلومیٹر۔

(۵)......انٹارکٹیکا/۱۳،۷۲۰،۰۰۰کلومیٹر۔

(۶)......یورپ/۱۰،۱۸۰،۰۰۰کلومیٹر۔

(۷)......آسٹریلیا/۹،۰۰۸،۵۰۰کلومیٹر۔

اب چوں کہ میرے سفر کا تعلق جنوبی افریقہ سے ہے،اس لیے پہلے افریقہ کے مختصر احوال پیشِ خدمت ہیں بعدہ جنوبی افریقہ۔

افریقہ:

رقبے کے لحاظ سے کرۂ ارض کا دوسرا برِّ اعظم ہے، جس کے شمال میں بحیرۂ روم، مشرق میں بحرِ ہند اور مغرب میں بحرِ اوقیانوس واقع ہے۔ دل کش نظاروں، گھنے جنگلات، وسیع صحراؤں اور گہری وادیوں کی سرزمین جہاں آج ۵۳ ممالک ہیں، جن کے باسی کئی زبانیں بولتے ہیں۔

افریقہ کے شمالی اور جنوبی حصے نہایت خشک اور گرم ہیں، جن کا بیشتر حصہ صحراؤں پر پھیلا ہوا ہے۔ ''خطِ استوا'' کے اردگرد گھنے جنگلات ہیں۔ مشرقی افریقہ میں ''عظیم وادی الشق'' کے نتیجے میں گہری گہری وادیاں وجود میں آئیں، جن میں کئی بڑی جھیلیں بھی واقع ہیں۔

''صحرائے اعظم'' شمالی افریقہ کے بیش تر حصے پر پھیلا ہوا دنیا کا سب سے بڑا صحرا ہے، اس عظیم صحرا کا ایک چوتھائی حصہ ریتیلے ٹیلوں پر مشتمل ہے، جب کہ بقیہ پتھریلے خشک میدان ہیں۔

''صحرائے اعظم'' کے جنوب میں صحرائی اور جنگلی علاقوں کو چھوڑ کر پورے براعظم میں گھاس کے وسیع میدان ہیں جو ''سوانا'' کہلاتے ہیں، یہی میدان ہاتھی سمیت افریقہ کے دیگر مشہور جانوروں کے مسکن ہیں۔

مشرق میں عظیم '' وادي الشق'' ہے، جو دراصل زمین میں ایک عظیم دراڑ کے نتیجے میں وجود پذیر ہوئی ہے ''کما قیل''، اگر یہ دراڑ مزید پھیلتی گئی تو ایک دن قرنِ افریقہ براعظم سے الگ ہوجائے گا، خط استوا کے ساتھ ساتھ بارشوں کے باعث گھنے جنگلات واقع ہیں، یہاں کا موسم گرم اور نمی سے بھرپور ہے۔

۱۹۶۰ء کی دہائی تک افریقہ کا بیش تر حصہ یورپی ممالک کے قبضے میں تھا اور طویل غلامی کے بعد ۱۹۸۰ء کی دہائی تک تقریباً تمام ممالک کو آزادی مل گئی؛ لیکن ان کے وسائل نوآبادیاتی دور میں غصب کر لیے گئے تھے، اس لیے اقتصادی ومعاشی طور

پر وہ آج تک نہ سنبھل سکے اور غربت کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ جہالت کے باعث نسلی وقومی تعصب نے بھی افریقی عوام کے دلوں میں جڑیں پکڑیں، جس کے نتیجے میں خوفناک جنگیں ہوئیں، جن میں لاکھوں انسان اجل کا نشانہ بن گئے۔

افریقہ کی بیش تر آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے، لیکن چند بڑے شہر بھی ہیں جن میں ''قاہرہ'' قابل ذکر ہے، اس کی آبادی ۶۵ لاکھ ہے اور یہ براعظم کا سب سے بڑا شہر ہے، شمال اور مشرق میں بیش تر ممالک کا مذہب اسلام ہے۔

معدنیات:

افریقہ معدنیات سے مالا مال ہے، اسی دولت نے اسے غلامی کے طویل دور سے دوچار کیا، یہاں پائی جانے والی معدنیات میں تیل، سونا، تانبا اور ہیرا خصوصاً قابل ذکر ہیں، کسی زمانے میں ''مالی'' میں دنیا میں پیدا ہونے والا نصف سے زائد سونا نکالا جاتا تھا۔

براعظم کے جنوبی علاقوں خصوصاً جنوبی افریقہ میں سب سے زیادہ کانیں ہیں، جہاں سے ہیرا، سونا اور یورینیم نکالا جاتا ہے۔

تانبے کے سب سے زیادہ ذخائر جمہوریہ کانگو اور زامبیا میں پائے جاتے ہیں۔ تیل الجزائر، انگولا، مصر، لیبیا اور نائجیریا میں نکلتا ہے۔

فصلیں:

افریقہ میں مختلف موسموں میں مختلف فصلیں بھی ہوتی ہیں، منطقہ حارہ کے علاقوں میں ربڑ اور کیلا اہم کاشت ہے، جب کہ مشرقی افریقہ چائے اور کافی کی کاشت کے حوالے سے شہرت رکھتا ہے، جن میں ''کینیا'' قابل ذکر ہے اور مغربی افریقہ میں مونگ پھلی، کوکو اور کافی کی کاشت ہوتی ہے۔

جنوبی افریقہ میں مختلف اقسام کی کاشت ہوتی ہے، جن میں پھل برآمد کیے جاتے ہیں اور انگوروں سے شراب کشید کی جاتی ہے۔

صنعتیں:

افریقہ کی بیش تر صنعتیں خام مال پر انحصار کرتی ہیں، چند افریقی ممالک کی صنعت ایک ہی فصل یا معدنی وسیلے پر منحصر ہے، لیکن کئی شہروں میں مختلف صنعتیں قائم کی جارہی ہیں، شمالی افریقہ کے ممالک، نائجیریا اور جنوبی افریقہ میں سب سے زیادہ صنعتیں ہیں۔

براعظم میں سب سے زیادہ تیل شمالی افریقہ کے مسلم ممالک اور مغرب میں بحرِ اوقیانوس کے ساتھ ساتھ واقع زیریں ممالک میں نکالا جاتا ہے۔

افریقہ کی گرمی:

افریقہ دنیا کا گرم ترین براعظم ہے، جہاں صحرائے اعظم میں ۱۲۲/ڈگری

فارن ہائٹ تک درجۂ حرارت ریکارڈ کیا گیا ہے۔اس کے جنوب میں ساحل کا علاقہ واقع ہے، جہاں درختوں کی کٹائی صحرائے اعظم کو جنوب کی طرف مزید پھیلنے کا موقع دے رہی ہے، خط استوا کے قریب بہت زیادہ بارش ہوتی ہے اور اسی لیے مغربی اور وسطی علاقوں میں گھنے جنگلات ہیں۔مزید جنوب میں موسم بہت خشک ہے اور قحط سالی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

ممالک افریقہ

شمار	مشرقی افریقہ	وسطی افریقہ	شمالی افریقہ	جنوبی افریقہ	مغربی افریقہ
۱	برونڈی	انگولا	الجزائر	بوٹسوانا	بینن
۲	جزائر قمر	کیمرون	مصر	لیسوتھو	برکینا فاسو
۳	جبوتی	وسطی افریقہ جمہوریہ	لیبیا	نمیبیا	کیپ ورڈی
۴	اریٹریا	چاڈ	مراکش	جنوبی افریقہ	آئیوری کوسٹ
۵	ایتھوپیا	جمہوریہ کانگو	سوڈان	سوازی لینڈ	گیمبیا
٦	کینیا	ڈیموکریٹک جمہوریہ کانگو	تیونس		گھانا

۷	مڈغاسکر	استوائی گنی			گنی
۸	ملاوی	گیبون			گنی بساؤ
۹	موریشش	ساؤٹوم وپرنسپ			لائبیریا
۱۰	ماپوٹ (فرانس)				مالی
۱۱	موزمبیق				موریطانیہ
۱۲	ری یونین (فرانس)				نائجر
۱۳	روانڈا				نائجیریا
۱۴	صومالیہ				سینٹ ہلینا (برطانیہ)
۱۵	تنزانیہ				سینی گال
۱۶	یوگانڈا				سیرالیون
۱۷	زامبیا				ٹوگو
۱۸	زمبابوے				

14

جنوبی افریقہ

دار الحکومت: پریٹوریا۔(باضابطہ وپارلیمانی) بلوم فاؤنٹین (عدالتی) کیپ ٹاؤن (قانونی)

عظیم ترین شہر : جوہانسبرگ

دفتری زبان : افریقی، انگریزی

نظام حکومت : پارلیمانی، جمہوریہ

آزادی: : برطانیہ سے

اتحاد : ۳۱مئی ۱۹۱۰ء

قانون ویسٹ منسٹر : ۱۱ر دسمبر ۱۹۳۱ء

جمہوریہ : ۳۱ر مئی ۱۹۶۱ء

کل رقبہ : 1221037 مربع کلومیٹر

پانی : برائے نام

آبادی : تخمینہ (2011) 50,586,757۔

کثافت آبادی : 39 فی مربع کلومیٹر/ 101 فی مربع میل۔

خام مال کی پیداوار : (تخمینہ 2011ء)

مجموعی : 422037 ارب بین الاقوامی ڈالر۔

فی کس	:	8,342 بین الاقوامی ڈالر۔
انسانی ترقیاتی اشاریہ	:	0.674
سکہ رائج الوقت	:	راند(ZAR)
ملکی اسم سائٹ	:	(انٹرنیٹ).za
رمز بعید تکلم	:	(کالنگ کوڈ)+27

افریقہ اور جنوبی افریقہ کی مختصر معلومات کے بعد اب افریقہ اور جنوبی افریقہ کے سیاہ فام، سفید فام، اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں:

افریقہ میں اسلام:

جیسا کہ اس سے قبل گزرا کہ برّ اعظم کل پانچ ہیں، ان میں دوسرا بڑا براعظم ''افریقہ'' ہے، لہٰذا افریقہ میں اسلام کی تاریخ اور جنوبی افریقہ میں اسلام ومسلمانوں کی تاریخ دونوں الگ موضوع ہیں۔

افریقہ میں اسلام اور مسلمان:

افریقہ دنیا کے قدیم ترین براعظم میں سے ایک ہے، بعض لوگوں نے افریقہ کو ''انسانِ اول'' کا وطن قرار دیا ہے، یعنی انسان ابتدائی دور میں افریقہ میں ظہور پذیر ہوا؛ مگر یہ درست نہیں ہے، کیوں کہ انسان کی ابتدائی تاریخ سیدنا وابونا وجدنا حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام سے وابستہ ہے، اور قرآن وحدیث کے بیان کے مطابق

15

انسان ارتقا پذیر مخلوق نہیں، بل کہ اللہ نے اسے تخلیقِ خصوصی کے ذریعہ وجود بخشا، اسے جنت میں ٹھہرا کر تعلیم وتربیت کی اور پھر زمین پر چوک کی پاداش میں ایشیا کے ملک ''سری لنکا یا جزیرۃ العرب'' کے خطہ پر اتارا۔

جن لوگوں نے انسان کی ابتدائی تاریخ افریقہ سے وابستہ کرنے کی کوشش کی ہے، وہ مغربی فلاسفہ، مؤرخین اور ان سے وابستہ مکتبۂ فکر کے افراد ہیں، جو دانستہ طور پر مادّی افکار کو فروغ دینے کے لیے سب سے زیادہ سہارا ''نظریۂ ارتقا'' سے لیتے ہیں، لہٰذا انسان کی ابتدائی تاریخ کو افریقہ سے وابستہ کرنے کے پیچھے بھی یہی فکر وفلسفہ اور سازش کارفرما ہے، وہ کہتے ہیں کہ بندر سے جو پہلا انسان ارتقا پذیری کے ذریعہ ظاہر ہوا وہ افریقی سیاہ فام تھا؛ مگر یہ سب باتیں محض قیاس وتخمین ہیں، ان کے پیچھے کوئی دلیل وبرہان نہیں ہے۔ ﴿**إن يتبعون إلا الظن وإن الظن لا يغني من الحق شيئا**﴾

(سوة النجم: ۲۸)

افریقہ کو ''**القارة المظلمة**'' اور '' **القارة السوداء** '' بھی کہا جاتا ہے، یعنی تاریک اور سیاہ براعظم، یا تو اس کے تاخیر سے انکشاف ہونے کی بنا پر یا وہاں کے لوگوں کے سیاہ فام ہونے کی وجہ سے۔

جنوبی افریقہ کے سیاہ فام لوگوں کی تاریخ:

مؤرخین کے اندازے کے مطابق جنوبی افریقہ میں جو سیاہ فام آباد ہیں، وہ درحقیقت مشرقی نائجیر یا یا شمالی افریقہ سے ہجرت کرکے آنے والے سیاہ فام ہیں۔

اس علاقہ میں بحرِ احمر اور خلیج فارس کے راستہ سے تقریباً آٹھویں صدی میں عرب پہنچے، اگرچہ براعظم افریقہ میں اسلام اپنے ابتدائی دور یعنی ۶۴۱ء میں مصر کے راستہ پہنچا تھا، اس خطہ کو عرب اور مسلمان مؤرخین ”بلاد الزنج“ سے یاد کرتے ہیں۔

بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ جنوبی افریقہ کے خطہ کے آباد ہونے میں ان کاشت کاروں کا اہم رول ہے، جو شمال سے وہاں پہنچے، اور ”بانتو“ زبان بولتے تھے۔

اس وقت افریقہ میں ۷۵/فی صد سیاہ فام لوگ ہیں، جو مختلف قبائل میں منقسم ہیں۔ ”زولو“ اس وقت سب سے بڑا قبیلہ ہے، اس کے بعد ”خوسا“، نیلسن منڈیلا کا تعلق اسی خوسا قبیلہ سے تھا، جنوبی افریقہ میں ایک برادری ”ملتون“ کی ہے جو ایشیا، یورپ اور سیاہ فام کے اختلاطی نکاح سے وجود میں آئی۔

جنوبی افریقہ میں سفید فام کی تاریخ:

یورپ کے اطراف واکناف، بل کہ اسپین میں داخل ہوکر، اقوام یورپ نے مسلمانوں کے تعلیمی اداروں اور دانش گاہوں سے بہت کچھ سیکھا، نئی ایجادات وجود میں آئیں، مشین کی ایجاد سے صنعت اور نقل وحمل میں حیرت انگیز حد تک تبدیلی آئی؛ مگر اسے فروخت کرنے کے لیے منڈیاں ایسی نہیں تھیں، جہاں ان مصنوعات کی کھپت ہوسکے، لہٰذا وہ اب اس بارے میں فکر مند ہوئے اور انہوں نے ”نئی دنیا کی دریافت“ کے نام سے اقتصادی وسیاسی اعتبار سے دنیا پر اپنا قبضہ جمانے کی ٹھان لی، بس پھر کیا تھا یورپی اقوام اپنے علاقوں سے نکل کر دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلنے کا پلان تیار کرنے لگی، ان کے لیے اس راستہ میں اگر کوئی سب سے بڑی رکاوٹ تھی

تو وہ مسلمانوں کی مضبوط سیاسی ومذہبی طاقت وخلافت ”خلافتِ عثمانیہ“، خلافت عثمانیہ وہ خلافت تھی جس نے بازنطینی دور کا خاتمہ کیا، جس کا سہرا خلیفہ محمد الفاتح کو جاتا ہے، جنہوں نے ۸۵۷ھ-۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کو فتح کیا اور اس طرح مسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار عیسائی طاقت جو آٹھ سو سال سے مزاحمت کر رہی تھی اس کا خاتمہ ہوگیا، اس کے بعد وہ رکے نہیں، انہوں نے یورپ میں پیش قدمی جاری رکھی، ’بلغاریا‘ کو ۹۲۷ھ میں ’بوڈا‘ کو ۹۳۲ھ میں اور فینا- جو لمسا کی راجدھانی اور یورپ کے قلب میں واقع تھا- کا محاصرہ کرلیا تھا۔

عثمانی خلافت کا ایک عظیم کارنامہ یہ بھی تھا کہ انہوں نے شمالی افریقہ کو صلیبیوں کی زد سے محفوظ رکھا۔ ۹۸۷ء میں سقوطِ غرناطہ کے سانحہ کے بعد مسلمانوں نے شمالی افریقہ کی طرف ہی ہجرت کی تھی، اس موقع پر عثمانیوں نے الجزائر کو خلافت کے ساتھ ملا دیا، پھر تیونس کو اسپانیوں کے ہاتھ سے آزاد کرالیا، پھر ۹۲۶ء میں طرابلس بھی آزاد کرالیا۔

اس طرح خلافتِ عثمانیہ افریقہ پر اہل یورپ کی یلغار کے سامنے ایک آہنی دیوار ثابت ہوئی اور یوں اہل افریقہ کا اسلام اور عربیت محفوظ رہی۔

عثمانیوں نے بحرِ احمر کو ایک اسلامی دریا بنا دیا، جسے صرف اور صرف مسلمان استعمال کرسکتے تھے، غرض یہ کہ خلافت عثمانیہ سے بہت سارے اسلامی علاقے آپس میں متصل ہوگئے اور وہ وحدت کی لڑی میں یک جا رہے، مشرق سے لے کر مغرب تک یعنی عراق سے لے کر مراکش تک کا سارا علاقہ خلافت عثمانیہ میں داخل ہوگیا تھا۔

جس دور میں یورپ میں صنعتی انقلاب برپا ہوا تھا، اس دور میں سمندری نقل وحمل کے تمام راستے مسلمانوں کے زیرنگیں تھے، کیوں کہ یورپ سے ایشیا وغیرہ کی طرف آنے کے لیے ترکی سے گزرنا ضروری تھا اور ترکی میں مضبوط اسلامی خلافت قائم تھی، یہی نہیں سمُندری راستوں کے علاوہ برّی مواصلات میں بھی عالم اسلام کا حصہ سب سے زیادہ تھا، کیوں کہ عالم اسلام کرۂ ارض کے وسط میں واقع تھا، اس لیے وہ سارے عالم کے لیے ایک گزرگاہ کی حیثیت رکھتا تھا، کیوں کہ ترکی یورپ اور ایشیا کو ملاتا ہے، لہٰذا اہل یورپ کے لیے ترکی سے گزرنا ضروری ٹھہرا۔

پانچویں صدی ہجری کے اواخر اور گیارہویں صدی عیسوی کے اختتام پر، عیسائیوں نے عالم اسلام پر صلیبی جنگ کے نام سے یلغار کردیا اور پھر دوسو سال تک بارہ بڑی بڑی جنگیں مسلمانوں اور صلیبیوں کے درمیان ہوئیں، ابتدا میں صلیبیوں کو کامیابی حاصل ہوئی؛ مگر مسلمان آہستہ آہستہ سنبھل گئے اور پھر اسدالدین شیرکوہ، صلاح الدین ایوبی، اشرف خلیل، ابن خلدون نے صلیبیوں کو عالم اسلام سے ۱۴۹۱ء تک باہر کردیا؛ مگر دوسری طرف ۱۴۹۲ء میں اندلس دوسو سال تک اپنا دفاع کرنے کے بعد سقوط کا شکار ہوگیا۔

ان صلیبی جنگوں سے یورپ کی مالی حالت مستحکم ہوگئی، جس کے نتیجہ میں سترہویں صدی میں صنعتی انقلاب وجود میں آیا اور پیداوار کی کثرت کی وجہ سے وہ منڈیوں کے لیے فکرمند ہونے لگے، جس کے لیے انہیں ہندوستان- جو بہت عظیم

ملک تھا اور اس زمانہ کا متمدن اور متمول ملک تھا جہاں مسلمانوں کی حکم رانی تھی -تک پہنچنے کی سعی شروع کردی، اندلس کی درس گاہوں سے انہیں دنیا کے جغرافیہ کا علم حاصل ہوا اور سمُندری راستے بھی معلوم ہوئے، اسبابِ تجارت کی بہتات ہوئی، مال بھی بہت ہوا، لہٰذا انھوں نے ہندوستان پہنچنے کے لیے اسی وقت کو مناسب تصور کیا اور اس کی تلاش میں یورپ کے ملاح یورپ سے کسی محفوظ راہ سے ہندوستان تک پہنچنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور انہیں نے اس ناپاک مہم کا نام ''نئی دنیا کی دریافت'' رکھا۔

جو ملاحین اس مہم کے لیے نکلے تھے وہ یہ ہیں:

(۱)......ہنری (۱۳۹۴،۱۴۶۰ء) پرتغالی تھا، افریقہ کی غربی ساحل اور گھانا اس کی دریافت ہے۔

(۲)......پارتلیمو دیاز (۱۴۵۰،۱۵۰۰ء) پرتغالی اور واسکوڈی گاما پرتغالی (۱۴۶۹،۱۵۲۴) جنوبی افریقہ اور پھر وہاں سے مڈغاسکر اور مغربی ہندوستان کے ملیبار تک پہنچے۔

(۳)......کریستوف، کولمبس اٹلی کا تھا، جس نے امریکہ کو دریافت کیا۔

(۴)......فریڈیناندو ماجلان (۱۴۸۰،۱۵۲۱) پرتغالی۔

(۵)......جون کابوت (۱۴۵۰، ۱۴۹۸ء) اٹلی کا تھا، جو برطانیہ سے شمالی امریکہ پہنچا۔

(۶)......جیمس کوک (۱۷۲۸،۱۷۷۹ء) نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کو۔

(۷)......سزادو جاک کارتیہ (۱۴۹۰، ۱۵۵۷ء)۔

یہ تھے یورپ کے مشہور سیاح اور ''نئی دنیا کی دریافت'' کرنے والے۔ یورپ کی اقوام میں خاص طور پر پرتگال، برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، بلجیکا، اٹلی، المانیہ، اسبانیہ نے ''نئی دنیا کی دریافت'' کے نام پر دنیا کے مختلف خطوں پر قبضہ کرکے وہاں کی اقوام کو ظلم و بربریت ہی نہیں عقلی، فکری، ذہنی غلامی میں جکڑ لیا اور ہر میدان میں مقامی باشندوں کو مغلوب و مقہور رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

''برطانیہ''......ملیشیا، ہندوستان، خلیج عرب کے ساحلی علاقوں مصر، سوڈان، یوگانڈا، تنزانیہ، اریٹریا، قبرص، گھانا، عراق، اردن، فلسطین پر قابض رہا۔

''فرانس''......چین، مالی، چاڈ، نیجیریا، سنغال، الجزائر، تونس، گینیا، شام، لبنان، کیلیکیا پر قابض رہا ہے۔

''اٹلی''......لیبیا اور صومالیا پر قابض رہا ہے۔

''روس'' سائبیریا، مغربی ترکستان، آڈال کی اسلامی ریاستوں پر، نیز قلعہ کے حوض ورقفقار کی ریاستوں اور ایران پر قابض رہا ہے۔

''ہالینڈ''......انڈونیشیا، جنوبی افریقہ پر قابض رہا ہے۔

''بلجیکا''......وسطی افریقہ کے ملک کوتغو پر قابض رہا ہے۔

آج یورپ دنیا کو یہ جتلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ اس نے دنیا کے مختلف نئے خطے تلاش کیے اور گویا وہاں پہنچ کر ان خطوں کو ترقیات سے نوازا اور دنیا پر بڑا احسان کیا؛ حالاں کہ یورپ کا یہ تأثر سراسر غلط اور دھوکہ ہے، اس لیے کہ وہ جہاں بھی گیا ظلم کیا، مقامی لوگوں کا خون چوسا، بل کہ ان کو غلام بنا کر بیچا اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو اپنے دوسرے مقبوضہ خطہ میں لے جا کر اس خطہ میں ان سے ظالمانہ کام کروایا، ان کے فن اور ہنر سے فائدہ اٹھایا، ایک دو نہیں ہر خطہ میں لاکھوں انسانوں کو قتل کیا یا اپنا مذہب اور تہذیب ترک کرنے پر مجبور کیا۔ اسے احسان کہیں گے؟!!

لاحول ولاقوۃ إلا باللّٰہ!

اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تاریخ بڑی تابناک اور روشن ہے، مسلمان دنیا کے جس خطہ میں پہنچا، الحمدللہ! اس نے عدل وانصاف، علم دوستی اور انسانیت نوازی کا مظاہرہ کیا، ظلم و بربریت سے اجتناب کیا، لوگوں کو زبردستی اپنے مذہب کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں کیا، ''نئی دنیا کی دریافت یا نو آبادیات'' کے الفاظ بظاہر جتنے خوش نما ہیں حقیقت میں اتنے ہی ہولناک اور ہلاکت خیز اور جہاد کے لفظ کو ان لوگوں نے جتنا بدنام کیا ہے وہ اتنا ہی رحمت سے مستعار ہے، ''گویا نو آبادیات یعنی زحمت اور مزاحمت اور جہاد یعنی رحمت اور عدل وانصاف و موانست۔'' اسی سے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کہیں بھی مسلمانوں کی حکومت کے ختم ہونے پر آزادی نہیں منائی جاتی، جب کہ انگریزوں سے آزادی پر ہر جگہ ''یوم آزادی'' منایا جاتا ہے، مسلمانوں نے عدل وانصاف سے کام لیا اور انگریزوں نے ظلم واستبداد سے، یہ صرف لفاظی نہیں، تاریخ اس پر شاہدِ عدل ہے۔ الحمدللہ!

افریقہ میں مسلمان سیاحوں کی آمد:

یورپ اگر چہ یہ دعویٰ کرے کہ اس نے افریقہ کو دریافت کیا؛ مگر الحمد للہ! مسلمان یورپ کی اقوام سے صدیوں پہلے وہاں پہنچ چکے تھے، بل کہ آج براعظم افریقہ میں تقریباً ۲۹/اسلامی مملکتیں موجود ہیں، اسی سے آپ مسلمانوں کے اثر و رسوخ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مسلمانوں کا شمالی افریقہ پر خاص اثر رہا ہے، مشہور مسلمان سیاح ابن بطوطہ، زنجبار، حبشہ، مالنڈی، بمبا مقدیشوں کی زیارت ۱۳۳۳ء میں کر چکے تھے۔ اسی طرح حسن ابن الوازن نے مغربی افریقہ کے مالی، سنیگال، بورنو وغیرہ کا سفر کیا اور لیو افریقی سے مشہور ہوئے، بل کہ آپ نے تو ''تاریخ وصف افریقہ'' کے نام سے کتاب بھی لکھی ہے۔

مسلمان مؤرخین میں خاص طور پر مسعودی، ابن حوقل، بکری، ادریسی، یاقوت الحموی، ابن خلدون وغیرہ نے افریقہ پر روشنی ڈالی ہے۔

اس حقیقت سے بھی انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ یورپی اقوام کی ان سمندری مہموں میں مسلمان ملاحوں اور سیاحوں اور ناخداؤں کا اہم ترین رول رہا ہے، امریکہ کی دریافت میں بھی اہم رول مسلمان ملاح کا ہے، اسی طرح واسکوڈی گاما کو افریقہ سے ہندوستان تک رہنمائی کرنے میں بھی مسلمان کا اہم رول ہے، اسی طرح نہر کونگو کی دریافت میں بھی مسلمان ملاح محمد ابن حمید المرجینی کا رول ہے۔

19

سفید فام افریقہ میں:

یورپی اقوام چار مرحلوں میں افریقہ پہنچی:

پہلا مرحلہ:

۱)...... پرتغالی ''رأس الرجاء الصالح'' یعنی کیپ ٹاؤن میں داخل ہوئے، ۱۴۱۵ء پھر ۱۴۸۴ء میں ڈیجوکم Diegocam جہاز راں کانگو پہنچا، ۱۴۹۷ء میں واسکوڈی گاما ''لیک ٹاؤن'' اور پھر وہاں سے ''کالیکٹ'' ہندوستان پہنچا۔

دوسرا مرحلہ:

افریقہ کے زمینی دفاتر اور مالی وسائل کو جاننے کے لیے ۱۸۶۹ء میں ہوا، لفنجستون کی موت سے یہ مرحلہ ختم ہوگیا۔ ۱۸۷۳ء میں یہ دور ختم ہوگیا۔

تیسرا مرحلہ:

سیاسی داؤ پیچ کے لیے ۱۸۷۴ء سے شروع ہوا، جس کا مقصد پورے افریقہ پر یورپی اقوام کی بالادستی تھی، پھر یورپی اقوام نے افریقہ کو آپس میں تقسیم کرلیا۔

چوتھا مرحلہ:

فلاسفہ اور معلومات جمع کرنے والے، افریقی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا۔

سفید فام جنوبی افریقہ میں:

اب تک مطلق براعظم افریقہ میں سفید فام اقوام کی تاریخ کو بیان کیا گیا، اب جنوبی افریقہ میں سفید فام کی آمد کو بیان کیا جارہا ہے۔

مؤرخین کے بیان کے مطابق سفید فام نے صنعتی انقلاب کے بعد اپنے مال کو فروخت کرنے کے لیے بحری راستہ سے ہندوستان پہنچنے کا جو محفوظ راستہ تلاش کیا تو وہ افریقہ ہوتے ہوئے ہی ہندوستان پہنچے، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ واسکوڈی گاما کو افریقہ سے ہندوستان کا راستہ دکھانے والا ایک مسلمان ملاح ''احمد ابن ماجد شہاب الدین الاسدی'' ہی تھا، جسے '' **أسد البحر** '' سے جانا جاتا ہے۔ یہ دراصل عمانی ملاح تھا اور سمندری راستوں کا بڑا ماہر تھا، واسکوڈی گاما پہلے سال نٹال میں (نٹال کو نٹال اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ''ناٹال'' کے دن وہاں پہنچا تھا)، پھر موزمبیق اور موزمبیق میں مسلمان حکمرانوں کے ہاتھ نہ لگنے سے مڈغاسکر کی طرف گیا اور وہیں اسے احمد ابن ماجد مل گیا اور اس سے مکمل معلومات لے کر وہ ہندوستان کی طرف آیا، بل کہ بعض کتابوں میں ہے کہ یہ واسکوڈی گاما کے ساتھ تھا اور اصل اسی نے راستہ دکھایا، گویا واسکو ڈی گاما نہیں، بل کہ ابن ماجد اصل ہندوستان کی دریافت کرنے والا ہے، الدکتور عبد الہادی التازی نے ابن ماجد پر مستقل کتاب "**ابن ماجد والبرتغال**" کے نام سے عربی میں لکھی ہے۔

۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما ناٹال پہنچا تھا۔

۱۵۸۹ء دریک کیپ ٹاؤن پہنچا تھا۔

برطانیہ نے ہندوستان میں تجارت کے لیے ۱۶۰۱ء میں ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' تشکیل دی، بالکل اسی طرز پر ہالینڈ نے بھی ۱۶۰۲ء میں ''ایسٹ انڈیا کمپنی''، تشکیل دی، ۱۶۵۲ء میں ہالینڈ نے کیپ ٹاؤن میں قیام پذیر ہونے کا فیصلہ کردیا اور وہاں پر ایک پورٹ بھی تیار کروایا۔

اسی عرصہ میں ہالینڈ نے انڈونیشیا میں بھی تسلط حاصل کیا تھا، لہٰذا وہاں سے مسلمان حکومت کے باغی مسلمانوں کو مزدوری کے لیے افریقہ لایا۔

ہالینڈ نے سفید فام کو لاکر آباد کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ ۱۷۹۵ء تک ان کی تعداد ۲۰/ ہزار ہوگئی، اسی عرصہ میں، بل کہ اسی سال برطانیہ نے کیپ ٹاؤن سے ہالینڈیوں کو نکال باہر کیا۔ ۱۸۰۲ء میں ہالینڈ نے پھر کیپ ٹاؤن حاصل کرلیا؛ مگر ۱۸۱۲ء میں پھر کیپ ٹاؤن پر برطانیہ کا قبضہ ہوگیا۔

برطانیہ نے بھی سفید فام لوگوں کو آباد کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ ۱۸۲۰ء میں ان کی تعداد بھی ۵۰۰/ سے تجاوز کرگئی۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ جنوبی افریقہ میں پہلے پرتغالی پہنچے؛ مگر وہ صرف ہندوستان سے گزرگاہ کے طور پر گزرے، زیادہ قیام انہیں مناسب نہیں معلوم ہوا، کیوں کہ اس زمین میں سونا ہے اور زرخیز ہے اس کا علم انہیں نہیں تھا؛ مگر اس کے بعد ہالینڈ کے سفید فام جب یہاں پہنچے تو ان پر منکشف ہوا کہ اگر چہ یہ علاقہ سیاہ فام لوگوں کا ہے؛ مگر تجارت، زراعت اور معادن ہر اعتبار سے بڑا سودمند ہے، لہٰذا

جیسا کہ برطانیہ نے ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کی بنیاد ڈالی، بالکل اسی طرز پر ہالینڈ نے ۱۶۰۲ء میں کمپنی کی بنیاد ڈال کر مستقل جنوبی افریقہ کو اپنا مقبوضہ علاقہ بنانے کا پلان بنالیا اور وہیں مقیم ہوگئے۔

اس کے بعد ہالینڈیوں نے اپنے دیگر مقبوضہ علاقہ سے اپنے مخالفین کو مزدور بنا کر یہاں لانا شروع کیا، مثلاً ہندوستان اور انڈونیشیا سے، اور ان پر بڑے بڑے ظلم ڈھائے۔

انیسویں صدی کے اوائل سے جنوبی افریقہ کے سیاہ فام باشندوں میں بیداری پیدا ہونا شروع ہوئی اور وہ آزادی کے لیے جدوجہد کرنے لگے اور ملک داخلی خلفشار وانتشار کا شکار ہوگیا؛ مگر چوں کہ سفید فام طاقت ور تھے، لہٰذا سیاہ فام قبائل اپنی آزادی میں کامیاب نہ ہوسکے اور ہزاروں افراد نے ملک سے ہجرت کرلی۔

سونے کی کانوں کا ظہور:

جیسا کہ اوپر گزرا کہ افریقہ کی طرف انگریز محض ایشیا پہنچنے کے لیے آئے تھے، اس کو گویا ایک ''مرکز الاستراحة''، یعنی آرام گاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے؛ مگر ۱۸۶۸ء میں الماس کی کانیں اور ۱۸۷۳ء میں سونے کی کانیں ظاہر ہوئیں، لہٰذا انگریز اقوام اس پر ٹوٹ پڑیں اور آپس میں دامن بہ گریباں ہونے لگیں، ہالینڈی اور برطانوی کے درمیان اسی غرض سے جنگیں ہوئیں، کیوں کہ اب افریقہ کاشت کاری سے معادن کے ذخیرہ کے لیے مشہور ہوگیا۔

جنوبی افریقہ کی اتحادی تشکیل:

انگریزوں نے اپنے اقتصادی نفع کے لیے ''جنوبی افریقہ اتحاد'' کو تشکیل دیا اور ۳۱؍مئی ۱۹۱۰ء میں اس کا اعلان کردیا گیا؛ مگر سیاہ فام اور دیگر اقوام کو بدستور ان کے حقوق سے محروم رکھا گیا۔

مذکورہ اتحاد سے قبل سیاہ فام ۱۹۰۹ء میں برطانیہ وفد کے ذریعہ پہنچے تھے اور اپنے حقوق اور حکومت میں شرکت کا مطالبہ کیا تھا؛ مگر سفید فام اقوام کی طرف جیسا کہ روایت چلی آرہی تھی انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی، ۱۹۱۲ء میں ''جزء المؤتمر الأفريقي'' نے مساواتِ حقوق کا مطالبہ کیا؛ مگر کوئی کامیابی نہیں ملی، ۱۹۳۱ء میں سفید فام اقوام نے سیاہ وسفید کے نسلی قوانین کو سختی سے نافذ کردیا۔

برطانیہ نے ٹرانسوال (Transval) کو ۱۹۰۶ء میں اور ینج (Orange) کو ۱۹۰۷ء میں خود مختاری کا پروانہ دیا، ۱۹۰۹ء میں استعماری طاقتوں نے اتحاد کی دستور سازی کا اجلاس بلایا اور ۳۱مئی ۱۹۱۰ء کے دن ''اتحاد جنوب افریقہ'' (Union of Soth Africa) کی تشکیل عمل میں آئی اور اب استعماری طاقتوں کے مختلف علاقے ''جدید اتحاد'' کا حصہ اور ریاستیں کہلائی جانے لگیں؛ مگر قابل تعجب بات یہ کہ سفید فام اقوام نے سیاہ فام اقوام کو ان کے حقوق سے بدستور محروم رکھا سوائے ’کیپ ٹاون‘ کے۔

''اتحاد جنوبی افریقہ'' کے بعد ''الحزب الوطني''، یعنی ''نیشنل پارٹی'' کے لیے جو مسئلہ تھا اس کے لیے برطانوی اور افریقی اقوام کو متفق کرنا، یہ ایک بڑا چیلنج تھا،

اسی لیے اتحاد کے بعد سب سے پہلا مسئلہ یہ کھڑا ہوا کہ اسکولوں اور عام پبلک مقامات پر کس زبان کو رائج کیا جائے ، انگریزی یا ہالینڈی ، پھر طے ہوا کہ دونوں کو مساوی طور پر رائج کیا جائے۔

''اتحاد جنوبی افریقہ'' کے بعد سیاہ فام اقوام کو اگر چہ حقوق سے محروم رکھا گیا؛ مگر اندر ہی اندر سیاسی بیداری کا آغاز ہو گیا اور ۱۹۰۹ء میں سیاہ فام اقوام کی چند چھوٹی چھوٹی سیاسی پارٹیاں بھی وجود میں آ گئیں اور انہوں نے اکثر سیاہ فام طبقہ کو حکومت میں شراکت سے محروم رکھنے پر صدائے احتجاج بلند کرنا شروع کر دیا اور جیسا کہ اس سے پہلے بھی بیان کیا گیا کہ سیاہ فام اقوام نے برطانیہ جا کر کوشش کی ؛ مگر کامیابی نہیں مل سکی ، سیاہ فام اقوام کا مطالبہ تھا کہ ہم ستر فی صد سے زائد ہیں ، لہٰذا دستور سازی میں ہمارے حقوق ہونے چاہیے ، اس کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ ۱۹۲۵ء میں افریقی زبان کو ملکی زبان کی حیثیت دی گئی ، ۱۹۳۱ء میں ہالینڈ برطانیہ سے مستقل الگ ہو گیا اور خود مختاری حاصل کر لی ، اس طرح جنوبی افریقہ ''دولت مشترکہ'' کا عضو بن گیا۔

۱۹۳۳ء میں ہالینڈی اقوام نے اپنے استحکام کے لیے نسلی قوانین کو سختی سے نافذ کر دیا ، جس میں سیاہ فام اقوام کے لیے رہائشی مقامات کی علاحدگی عمل میں آئی ، اسی طرح سفید فام کے لیے بھی ٹرینوں اور بسوں تک میں علاحدہ علاحدہ نشستیں وغیرہ متعین کی گئیں ، رات کے اوقات میں کوئی غیر سفید فام سفید فام کے علاقہ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا ، ورنہ سخت عتاب کا شکار ہوتا اور بھی بہت کچھ۔

دوسری عالمی جنگ کے موقع پر سیاسی اختلاف ہو گیا ، سمطس برطانیہ کی طرف داری کا قائل تھا اور ہیرنزوج جرمنی کا حامی تھا ، ۱۹۳۹ء کے انتخابات میں سمطس کو کامیابی حاصل ہوئی ، جو برطانیہ کا طرف دار تھا اور دوسری عالمی جنگ کے موقع پر جنوبی افریقہ برطانیہ کے شانہ بشانہ رہا۔

اس کے بعد سیاہ فام اقوام میں سیاسی شعور کی بیداری شدت پکڑ گئی ، دوسری جانب حکومت کے موقف سے سفید فام بھی نالاں ہو گئے اور ایک نئی سیاسی پارٹی وجود میں آئی ، ''ملان پارٹی نیشنل پارٹی'' کے نام سے ، ۱۹۴۸ء کے انتخابات میں ملان پارٹی نے نیشنل پارٹی کی حکمراں جماعت کو شکست دی اور پھر سیاہ فام کی آزادی تک وہی حکمراں رہے۔

۱۹۵۰ء میں ''نیشنل پارٹی'' نے ''آبادی رجسٹریشن ایکٹ'' کا قانون جاری کیا اور نسل پرستی کی بنیاد پر علاحدہ اسکول اور رہائشی مقامات اور جامعات کا فیصلہ کیا ، اس سے نسل پرستی کے خلاف احتجاج شدت اختیار کر گیا اور سیاہ فام اقوام نے سفید فام کی طرح اپنے لیے بھی شناختی کارڈ جاری کرنے کا مطالبہ کیا گیا ، تاکہ سیر و سیاحت میں سہولت ہو ؛ مگر ان کی ایک نہ سنی گئی ، ۱۹۶۰ء میں سیاہ فام اقوام کا نسل پرستی اور اس کے امتیازی قوانین کے خلاف احتجاج عروج کو پہنچا اور ملک میں مظاہرے ہونے لگے ، یہاں تک کہ حکومت نے ان پر گولیاں چلائیں اور تقریباً ۶۹ ؍سیاہ فام قتل کر دئے گئے اور حکومت نے نسلی امتیاز کے خلاف احتجاج کرنے والی افریقن نیشنل کانگریس (African National Congress) پر پابندی لگا دی ، جو ۱۹۶۰ء سے

لے کر ۱۹۹۰ تک رہی اور نسلی امتیاز کے خلاف آواز اٹھانے والے کے ساتھ سختی سے کام لیا گیا؛ البتہ ۱۹۸۰ اور ۱۹۹۰ کے درمیان حکومت نے نسلی امتیاز کے قوانین میں تخفیف کی اور بعض سخت قوانین کو منسوخ کر دیا۔ ۱۹۸۴ میں نیا دستور تیار کیا گیا؛ مگر اس دستور میں بھی سیاہ فام اقوام کو کسی طرح کے حقوق نہیں دیے گئے، جس کی وجہ سے سیاہ فام قتل و غارت گری پر اتر آئے، ''تنگ آمد بہ جنگ آمد'' کی کہاوت کے تحت ۱۹۸۶ء سے یورپی حکومتوں اور دولت مشترکہ اور امریکہ نے جنوبی افریقہ سے تجارتی بائیکاٹ کیا، جو کلی نہیں بل کہ جزوی تھا یعنی بعض چیزوں کی تجارت پر پابندی لگادی۔

۱۹۸۹ء میں بوٹھا {P.W.Botha} وزیر اعظم نے بیماری کی وجہ سے علاحدگی اختیار کر لی تو (F.w.de Klerk) کو اس کی جگہ منتخب کیا گیا اور نئے وزیر اعظم نے سیاسی اصلاحات شروع کر دیں اور افریقن نیشنل کانگریس (African National Congress) پر پابندی ہٹادی اور بعض اس کے سرکردہ رہنماؤں کو جیل سے خلاصی دے دی گئی، جن میں نیلسن منڈیلا (Nelson Mandela) بھی تھے اور اس کے بعد آزادانہ گفت و شنید شروع ہوگئی، کہ ملک کو مستقبل کے خطرات سے کیسے بچایا جائے؟ یہاں تک کہ ۱۹۹۱ء میں تمام نسلی امتیاز کا خاتمہ ہوگیا، بل کہ انتخابات میں بھی تمام اقوام کو ووٹ دینے کا حق دیا گیا جو اب تک نہیں تھا، تعجب کی بات ہے کہ مشکل سے پندرہ، بیس فی صد سفید فام ہی کو اس سال تک ووٹ دینے کا حق تھا اور دیگر ستر فی صد سیاہ فام، باوجود اپنی کثرت کے ووٹ دینے سے بالکل محروم رکھے گئے۔

اپریل ۱۹۹۴ء میں پہلی بار نسلی امتیاز سے پاک انتخابات کا اعلان کر دیا گیا اور نیا دستور جاری کیا گیا، جس میں دو پارلیمانی مجلسوں کا اعلان کیا گیا، ''نیشنل اسمبلی'' جو ۴۰۰ اعضاء پر مشتمل ہوگی اور ''سینیٹ'' جس کے ارکان قانون ساز اداروں کے منتخب ہوں گے جو ریاستوں میں پائے جاتے ہیں۔

انتخابات سے قبل نگرانی کے لیے ''عبوری ایگزیکیٹو کونسل'' کی تشکیل عمل میں لائی گئی، تاکہ انتخابات کے دوران کسی طرح کی ناانصافی نہ ہونے پائے اور مئی ۱۹۹۴ء میں انتخابات ہوئے، جس میں نیلسن منڈیلا (Nelson Mandela) سیاہ فام وزیر اعظم منتخب ہوئے، جو تین سو سالہ تاریخ کا پہلا واقعہ تھا، انتخابات سے قبل سیاہ فام قبائل کے درمیان خون ریز تصادم بھی ہوا، جس میں بیسیوں ہزار افراد ظلم و تشدد، قتل و غارت گری کا شکار ہوئے۔

۱۹۹۶ میں دستور پر ایک بار پھر غور و خوض کیا گیا اور بہت ساری ایسی شقوں کا اضافہ کیا گیا جو تمام افراد کو زیادہ سے زیادہ آزادی دیتی تھیں، مثلاً: آزادیٔ رائے، آزادیٔ صحافت، آزادیٔ سیاست وغیرہ، اسی طرح دستور میں تمام ابنائے ملک کو مساوی حقوق دیئے گئے، تعلیم، رہائش گاہ وغیرہ ہر چیز میں اور پھر اپنے عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے منڈیلا نے دست برداری کا اعلان کر دیا، بہر حال منڈیلا نے اپنی فراست سے انتہائی منصفانہ فیصلے دیے اور ملک کو ہر طرح کی قتل و غارت گری اور تباہی سے بچالیا، انہوں نے کامیابی کے بعد اعلان کر دیا کہ یہ ملک ہم سب کا ہے، ہم یہاں سے کسی کو نہیں بھگائیں گے اور نہ کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی ہوگی، کالے، گورے، مسلمان سب مطمئن رہیں اور ہر ایک اپنے اپنے کام کو بہ خوبی انجام دے۔

واقعتاً یہ بڑا اہم فیصلہ تھا، ورنہ پورا ملک تباہ ہوسکتا تھا، ایک منصف مزاج آدمی کے فیصلے نے ملک کو تباہی سے بچالیا، شاید منڈیلا کی جگہ کوئی اور آدمی ہوتا تو گوروں سے انتقام لیتا، جنہوں نے سیاہ فام اکثریت پر ۳رسو سال تک مظالم کے پہاڑ توڑے تھے، خود منڈیلا ۲۷رسال جیل میں گزار کر آئے تھے؛ مگر عفو و درگزر کی بے مثال روایت قائم کی اور وہ بھی ظلم و بربریت کے اس دور میں واقعتاً اسے بے مثال کارنامہ کہا جانا چاہیے، جو آج دنیا کے مختلف سیاست دانوں کے لیے سبق ہے۔

منڈیلا کے بعد ان کے نائب ''تھابومبیکی'' (Thabo Mvuya wa mabeki) کو پارٹی کا صدر بنایا گیا اور ۱۹۹۹ء کے انتخابات میں ''حـــــزب المؤتمر الو طني الأ فر يقي '' پھر دوبارہ کامیاب ہوئی اور ۴۰۰ میں ۲۶۶ نشستیں اس نے حاصل کیں اور پارلیمنٹ نے ''تھابومبیکی'' کو وزیر اعظم منتخب کرلیا، اس کے بعد ۲۰۰۸ میں جیکو ب زوما (Jacob gedleyihleksa zum) وزیر اعظم بنائے گئے اور ۲۰۱۱ء میں دوبارہ وہی کامیاب ہوئے جو آج بھی وزیر اعظم ہیں۔

انگریز تسلط کے منفی اثرات:

سیاہ فام اقوام پر سفید فام کی استعمار کے بڑے ہولناک اثرات مرتب ہوئے ہیں، وہ مندرجۂ ذیل ہیں:

۱- سیاہ فام افراد کی اکثریت تعلیم سے ناآشنا ہے۔

۲- سفید فام تسلط نے انہیں کپڑے اور میوزک کی ایسی لت لگائی ہے کہ وہ اپنی ساری کمائی کپڑے، بال، میوزک، ناچ گانے اور شراب نوشی پر آج بھی صرف کر دیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میوزک کے وہ ایسے دیوانے ہیں کہ اگر عین جنگ کے دوران بھی میوزک شروع کردی جائے تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ناچنے لگ جائیں گے۔

۳- سیاہ فام اقوام کی اکثریت غربت کی شکار ہے اور اسی غربت کی وجہ سے وہ لوٹ مار اور قتل و غارت گری پر فوراً آمادہ ہو جاتی ہے۔

۴- سفید فام کے زمانہ سے وہ اپنے مخصوص کھانے ''مکئ'' کی عادی ہے، آج بھی بدستور اسی پر قائم ہے اور اس قوم میں کھانے کا کوئی شوق و ذوق نہیں ہے۔

۵- انگریز اور سفید فام اقوام جہاں بھی گئی، اس نے لڑائی اور حکمرانی کے ضابطہ پر عمل کیا، یہی اصول دوسری جگہوں کی طرح یہاں بھی اپنایا، نتیجہ یہ ہوا کہ آج بھی قبائلی عصبیت کی بنیاد پر فتنہ فساد ہوتا رہتا ہے۔

۶- انگریز فواحشات اور زناکاری کے عادی رہے ہیں، فری سیکس ان کے یہاں عام ہے، جس کے اثرات سیاہ فام اقوام پر آج بھی ہیں، بریں بنا جنوبی افریقہ اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ ایڈز زدہ ملک ہے، جہاں تقریباً دس فی صد افراد اس مہلک مرض کا شکار ہیں۔

۷- الحاد اور بے دینی یا عیسائیت کا شیوع، سیاہ فام اکثر یا تو ملحد ہیں یا عیسائی۔

چند مثبت اثرات:

بہر حال سفید فام استعمار کے کافی منفی اثرات ۲۰ رسال پورے ہونے کے بعد آج بھی پائے جاتے ہیں، البتہ ساتھ ہی گنے چنے مثبت اثرات بھی ہیں:

۱- ملک میں سڑکوں کا نظام بڑا منظّم ہے، انتہائی عمدہ اور مضبوط سڑکیں پورے ملک میں پائی جاتی ہیں۔

۲- سیاہ فام اقوام میں چند اچھے اخلاق پائے جاتے ہیں مثلاً: ترتیب و تنظیم، نظافت، بڑوں کی تعظیم، چھوٹے سے چھوٹے تعاون پر شکریہ اور Thankyou کہنے کا رواج یہ وہ چیزیں ہیں، جو آج بھی سیاہ فام اقوام میں موجود ہیں؛ مگر ان کے مظالم کے سامنے یہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

افریقہ کے سفر سے ایک سبق یہ بھی ملا کہ ہمارے اسلاف نے ہندوستان میں انگریزوں کی ملک میں آمد سے ہی جو مخالفت شروع کی اور انہیں چین سے حکمرانی کا موقع نہیں دیا، وہ ہمارے لیے انتہائی مفید ثابت ہوا کہ ہندوستانیوں کی نسلیں سفید فام اقوام کے منفی اثرات سے ایک حد تک محفوظ رہیں، ورنہ اگر ہمارے اسلاف بھی سیاہ فام اقوام کی طرح watch and wait دیکھو! اور انتظار کرو! والا طریقہ اختیار کرتے تو آج تک آزاد نہ ہوتے اور سیاہ فام افراد سے زیادہ منفی اثرات ہمارے ملک کے باشندوں پر پڑتے۔ اللہ جزائے خیر عطا فرمائے شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، سراج

الدولہ، ٹیپو سلطان شہیدؒ، سید احمد شہیدؒ، سید اسماعیل شہیدؒ، حاجی امداد اللہؒ، حافظ ضامن شہیدؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، شیخ الہندؒ اور شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ وغیرہ کو کہ ان حضرات نے بڑی فراست اور دور اندیشی سے کام لیا، ایک طرف انگریز تسلط سے آزادی کے لیے ان تھک محنتیں اور قربانیاں دیں اور دوسری جانب مسلمانوں کو فکری ارتداد سے بچانے کے لیے نئے طرز پر مدارسِ اسلامیہ اور جامعاتِ عربیہ کا قیام عمل میں لائے، جس سے بعد میں چل کر تحریکِ جماعتِ تبلیغ اور خانقاہی نظام کے ساتھ ساتھ ملک کی آزادی کے لیے مر مٹنے والے مجاہدین پیدا ہوئے اور اس کے اثرات صرف ملکِ ہندوستان ہی پر نہیں پوری دنیا پر ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

الحمدللہ! مدارس اور دعوت وتبلیغ وخانقاہیں آج بھی دنیا کے سامنے صحیح اسلامی تعلیمات کو پیش کر رہے ہیں، تمام براعظموں کی اسلامی غیر اسلامی ریاستوں پر اس کے مثبت اثرات ہیں، اس لیے انگریز مدارسِ اسلامیہ کی بیخ کنی پر تلا ہوا ہے، کہ کسی طرح ان مدارسِ اسلامیہ کو بند کر دیا جائے یا اسے ''ماڈرنائز'' کر دیا جائے یا اس کی شبیہ کو بگاڑ دیا جائے، تاکہ مسلمانوں کے لیے جو ایمانی پاور ہاؤس ہے وہ نہ رہے۔

اللہ ان کی سازشوں سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین

یہ ہوئی جنوبی افریقہ کی سیاسی تاریخ، اب جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔

افریقہ میں اسلام کے اولین نقوش:

افریقہ دنیا کا وہ خوش نصیب براعظم ہے، جہاں جزیرۃ العرب ہی نہیں مکہ مکرمہ کے بعد سب سے پہلے اسلام کی کرنیں پہنچی تھیں۔ شیخ امان بن علی جامی کی کتاب ''**مسيرة الدعوة الإسلامية في أفريقيا عبر التاريخ**'' کے مقدمہ میں ابراہیم ہلال نے لکھا ہے کہ افریقہ مسلمانوں کا سب سے پہلا دار الہجرت ہے، جب کفارِ مکہ نے آغازِ اسلام کے دور میں تشدد کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہؓ کو حبشہ کی طرف ہجرت کے لیے کہا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افریقی اقوام حق پرست ہے، تعصب ان کی طبیعت میں نہیں ہے اور اصحاب بصیرت بھی ہیں، ساتھ ہی ان کے اندر خیر اور شر میں تمیز کا ملکہ بھی ہے، جب ان کے سامنے خیر پیش کیا جاتا ہے وہ اسے تسلیم کر لیتے ہیں اور شر سے دور ہو جاتے ہیں، بڑے عمدہ الفاظ میں ان کے مذکورہ اوصاف کو موصوف نے عربی میں بیان کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

''إن الأفارقة أناس صفت نفوسهم، وليس لهم تعصب في الباطل، وإنما هم أولو بصيرة نفاذة، وعقل وقاد، وقدرة على التمييز بين الخير والشر''۔

(ص/۲)

پروفیسر جامی فرماتے ہیں:

''قارة أفريقيا أول قارة سعدت وتنورت بنور الإسلام بعد

26

الجزيرة العربية، وفد الإسلام من مكة المكرمة أول ما وفد على الجزيرة، فحل في جزء من أفريقيا ''الحبشة'' المعروفة اليوم بأتوبيا، وبالتجديد ب''أريتريا''حل الإسلام في ذلك الجزء من أفريقيا قبل أن يعرج على أيّ مكان آخر،حتى على المدينة دار الهجرة.''

(ص/۷)

یعنی سرزمین مکہ سے نکل کر سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس صحابہؓ کا قافلہ افریقہ پہنچا، اس وقت جب کہ اسلام ابھی مدینہ بھی نہیں پہنچا تھا، افریقہ کے ملک حبشہ جس کو آج کل ''اتھوپیا'' کہا جاتا ہے، وہاں ہجرت کرنے والوں میں صرف صحابہؓ ہی نہیں آلِ رسول میں سے حضرت جعفر طیارؓ اور حضرت رقیہؓ بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھیں، تو اندازہ لگائیں کس قدر قسمت والا یہ خطہ ہوگا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں کسی اور جگہ ہجرت کا حکم نہ دے کر حبشہ اور افریقہ ہی کی طرف ہجرت کا حکم دیا؟ یہ حکم خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا یا وحی تھی؟ اور یہ ہجرت کس سنہ میں ہوئی؟

اس سلسلے میں عبدالکریم عبدالسلام تحریر فرماتے ہیں: ''کہ سب سے پہلے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ ہجرت الی الحبشۃ یہ حکم الٰہی سے ہوئی'' اور اس میں حکمت ایزدی یہ تھی کہ مسلمانوں کو آغازِ اسلام ہی سے مجاہدات اور مشقتوں کے برداشت کا عادی بنایا

جائے کہ اسلام کے خاطر اگر جان کی قربانی کی نوبت آئے تو حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کی طرح مسلمان تیار رہیں اور اگر وطن، اعزا و اقارب اور مال و دولت کو ترک کرنے کی نوبت آئے تو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کے لیے بھی تیار رہیں، گویا جان و مال، وطن و رشتہ دار کوئی بھی دین کے بارے میں رکاوٹ نہیں ہونے چاہیے، یہ سچے اور پکے مسلمان ہونے کی دلیل ہوگی۔

اسباب و مقاصد ہجرت اولیٰ:

۱-قریشِ مکہ کا مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑنا، ایسے مظالم کہ اگر پہاڑ پر ہوں تو وہ بھی پگھل جاتا، لہٰذا دین کی حفاظت کے لیے ہجرت ہوئی کہ کہیں شدتِ تکالیف، ترکِ حق یا ضعفِ حق کا باعث نہ ہونے پائے۔

۲- مکہ میں دن بہ دن اسلام میں داخل ہونے والوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور خطرہ تھا کہ کہیں مکہ ہی میں کوئی جنگ قریش کے ساتھ نہ چھڑ جائے اور پورا جزیرۃ العرب قریش کا معاون نہ بن جائے اور یوں دعوت کے کام کی رفتار متاثر ہو جاتی۔

۳-ممکن ہے اس ہجرت کا ایک مقصد یہ بھی ہو کہ قریش کے دلوں میں نرمی پیدا ہو، کیوں کہ اکثر و بیشتر گھرانے کے افراد ہجرت میں شامل تھے اور ہوا بھی ایسا ہی کہ بہت سے افراد ہمدردی جتانے لگے، بل کہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

۴- ہجرت کا پانچویں ہجری میں ہونا یہ ثابت کرنے کے لیے بھی تھا کہ اسلام کی دعوت کا انحصار صرف مکہ اور جزیرۃ العرب پر نہیں ہے، بل کہ یہ عالمی پیغام ہے جو کبھی تھمنے والا نہیں، اسی لیے حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں نے بالکل علانیہ وہاں پر اسلامی شعائر کی بجا آوری کی، یہاں تک کہ نصاریٰ کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور نجاشی بھی اسلام میں داخل ہو گئے، بل کہ حضرت عمرو ابن عاصؓ کے اسلام کا سبب بھی ان کا سفر حبشہ تھا، وہیں سے چنگاری دل میں لگ چکی تھی۔

۵- ہجرت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہ تجربہ کیا جائے کہ مسلمان ضعف کے باوجود کسی نئے مقام پر اپنی دعوت کو کیسے پہنچائیں اور کامیابی کیسے حاصل کریں۔

۶- ہجرت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ دشمنانِ اسلام کو یہ بتایا جائے کہ

ع...... پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

گویا ہجرت کفار مکہ کے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں تھی اور گویا مسلمانوں نے ہجرت کو ذریعۂ ابلاغِ دین بنا دیا۔ اللہ اکبر!

حبشہ ہی کا انتخاب کیوں؟

۱- اس لیے کہ حبشہ میں کوئی عربی قبیلہ نہیں تھا، لہٰذا قریش کا اثر وہاں نہیں چل سکتا تھا اور مسلمان ہجرت کے بعد وہاں اپنے دین پر اطمینان سے عمل کر سکتے تھے اور دعوت کا کام بھی کر سکتے تھے، کیوں کہ دیگر قریبی علاقوں مثلاً عراق اور شام وغیرہ میں قریش کا اثر و رسوخ تھا، تجارتی تعلقات تھے اور وہاں کے حالات بھی حبشہ کی طرح پر امن نہیں تھے۔

۲-حبشہ کا بادشاہ سمجھدار تورات کا عالم تھا، ساتھ ہی عدل وانصاف میں بھی مشہور تھا، یہ بھی مشہور تھا کہ وہ ہمیشہ حق کی جستجو میں رہتا ہے۔

۳-اہل حبشہ دینِ مسیح پر تھے اور ان کے مذہب کی تعلیمات میں مودت کا عنصر غالب تھا، لہٰذا ظلم کا اندیشہ نہیں تھا۔

۴-اہل حبشہ عمومی اعتبار سے بھی نرم دلی میں مشہور تھے، لہٰذا مسلمان امن کے ساتھ وہاں رہ سکتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ حبشہ- جو صحیح روایت کے مطابق آج کل ''اتھوپیا'' سے مشہور ہے- جزیرۃ العرب کے بعد سب سے پہلا اسلام کا محفوظ قلعہ رہا ہے، یہاں اللہ کی حکمت یہ بھی ذہن میں آتی ہے کہ سیاہ فام لوگوں کی طرف ہجرت کرا کر اسلام نے رنگ ونسل کے بھید بھاؤ کو ختم کرنے کے لیے پہلا قدم اٹھایا کہ اللہ کے نزدیک گورا اور سفید ہونا کوئی حیثیت نہیں رکھتا، طبیعت میں بھلائی ہونی چاہیے، یہاں سے سیاہ فام لوگوں میں طبعی اعتبار سے نرم خو ہونا، عدل پسند اور حق کا پرستار ہونا بھی سمجھ میں آتا ہے، مگر یہاں کوئی سوال کر سکتا ہے کہ ہم خود دیکھ رہے ہیں کہ سیاہ فام بڑے لڑاکو ہیں، جیسا کہ عصر حاضر میں افریقی ممالک کے احوال کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے؟ تو میں کہوں گا کہ ان کی طبیعت کی نرمی میں کوئی شک نہیں، کیوں کہ میں خود ان کو قریب سے دیکھ آیا ہوں بل کہ صبر وتحمل اور بردباری تو مجھے ان کا خاصہ معلوم ہوئی اور موجودہ احوال تو کیا سیاہ فام اور کیا سفید فام دیگر خطوں کا بھی یہی حال ہے!!! یہ سب مغرب کی ظالمانہ پالیسی اور ملحدانہ افکار کا نتیجہ ہے۔

دوسری وجہ صدیوں تک ان کا ظلم کی چکی میں پستے رہنا بھی ہے، یہ بیچارے مظلوم تنگ آ گئے ہیں، آج بھی مغرب ہی ان کو قومیت اور وطنیت کے نام پر لڑوا کر ان کا قیمتی خزانہ ہڑپ کر رہا ہے۔

اللہ سیاہ فام حضرات کو ان کے کھوئے ہوئے اخلاق لوٹا دے اور مغرب کے مکر سے ان کی حفاظت فرمائے۔آمین!

خلاصہ یہ کہ مجموعی طور پر براعظم افریقہ میں اسلام کل دو ادوار میں داخل ہوا۔

۱-دور صحابہ: سنہ نبوی پانچ میں مختصر وفد کی صورت میں اور اس کے دو سال بعد تقریباً سو افراد پر مشتمل صحابہؓ کی دوسری جماعت، جس میں حضرت عثمانؓ اور ان کی اہلیہ حضرت رقیہؓ بھی شامل تھیں۔

اس کے بعد حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں ''تیونس'' کے راستہ سے اسلام پہنچا، جس میں سات صحابہؓ شریک تھے، سب کا نام عبداللہ تھا:

۱-عبداللہ ابن ابی سرحؓ
۲-عبداللہ ابن زبیرؓ
۳-عبداللہ ابن مسعودؓ
۴-عبداللہ ابن عمرؓ
۵-عبداللہ ابن عباسؓ
۶-عبداللہ ابن جعفرؓ
۷-عبداللہ ابن عمرو ابن عاصؓ

(مسیرة الدعوة الإسلامیه في أفریقیاعبر التاریخ: ص۱۴)

پھر حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ میں شمالی افریقہ کے راستہ بذریعہ فتوحات، اسلام داخل ہوااور اسی دور میں مغربی افریقہ اسلام میں داخل ہوا، گویا دورِ اول میں بذریعہ دعوت واخلاق اور بذریعہ جنگ بھی۔

۲- دورِ ثانی: یہ غالبًا دوسری صدی ہجری کے بعد کا دور ہے، جب اسلام تاجروں اور مشائخ صوفیا کے ذریعہ مشرقی افریقہ میں حبشہ، سوڈان اور صومالیہ کے راستہ سے پھیلنے لگا اور بڑی تعداد میں لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔

(ایضًا:۱۵)

اگرچہ جامی صاحب نے حضراتِ صوفیا کے دعوتی کام کو یکسر مسترد کر دیا ہے، یہ کہہ کر کہ صوفیا نے اسلام کے نام پر لوگوں کو گمراہ کیا اور لوگوں کو اسلام کے نام پر غیر اسلام کی دعوت دی؛ مگر ناکارہ ان کی رائے سے اتفاق نہیں کرتا، کیوں کہ جامی صاحب کا تعلق ''جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ'' سے ہے اور عام طور پر ان لوگوں میں عدم تقلید کا رجحان اور کلی طور پر علمِ کلام اور تصوف وتقلید کا انکار رچا بسا ہوتا ہے اور ان کی طبیعتوں میں تشدد بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی مقلد کو چاہے وہ مقلد حنفی ہو، چاہے شافعی، ماتریدی ہو یا اشعری، تصوف سے منسلک ہو یا نہ ہو، ان سب کو العیاذ باللہ! مشرک گردانتے ہیں، یہ غلو ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔

میں اپنے محدود مطالعہ کے مطابق یہ کہنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتا ہوں کہ جزیرۃ العرب سے دور دراز علاقوں میں دعوت اسلام کے ابلاغ میں صوفیا کا بڑا اہم کردار رہا ہے، چاہے وہ برصغیر ہو یا افریقی و یورپی ممالک، اس کا انکار ایک تاریخی حقیقت کا انکار ہے، بل کہ ایک سچائی کی تکذیب ہے۔

ہاں! البتہ اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ کچھ ضرور ہوں گے تصوف میں غلو کرنے والے؛ مگر بعض کی وجہ سے تمام دعاۃ کی خدمتِ دین کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، یہ ایسا ہی غلو ہے جیسا کہ غیر مقلدوں کا اپنے مخالف کے رد میں غلو ہے کہ صدیوں سے امت اشاعرہ اور ماتریدیہ کے اہل سنت ہونے کی قائل رہی ہے اور یہ انہیں کلابیہ اور معتزلہ کی فہرست میں شمار کرتے ہیں، جو سراسر ناانصافی، ظلم اور غلو ہے، اللہ انہیں صحیح سمجھ عطا فرمائے۔ آمین!

بہرحال صحابہؓ کے بعد تاجروں، مجاہدوں اور مشائخ وصوفیا کے ذریعہ اسلام اس براعظم میں پھیلا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تقریباً ۲۹/اسلامی ممالک پائے جاتے ہیں، باوجود یہ کہ انگریز اقوام تقریباً تین صدیوں تک براعظم افریقہ کے تمام ممالک پر قابض رہیں؛ مگر الحمدللہ! تمام مظالم اور عیسائی مشنری اور الحادی نظامِ تعلیم کی سازش کے باوجود، اسلام اکثریت کے نفوس میں جمارہا؛ البتہ ایک طبقہ غربت کا مارا ضرور ارتداد سے دوچار ہوا، اللہ ان کی ہدایت کے فیصلے فرمائے اور آئندہ گمراہی سے محفوظ رکھے۔

الله أكبر

براعظم افریقہ کی اسلامی ریاستیں

افریقہ کے اسلامی ممالک پر نوآبادیاتی استعمار کا قبضہ:

جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ صنعتی انقلاب کے بعد یورپ نے عالم اسلام پر ہلہ بول دیا اور اکثر اسلامی ممالک کو ہڑپ کر لیا، جن میں سے افریقہ کے اسلامی ممالک بھی تھے۔ نپولین نے افریقہ کا مشہور اسلامی ملک مصر جو سلطنت عثمانیہ کا ایک حصہ تھا ۱۷۹۸ میں فتح کیا، لیکن یہ قبضہ زیادہ دیر پا نہ رہا، جلد ہی محمد علی نے فرانسیسیوں کو مصر سے نکال دیا-۱۸۶۹ میں نہر سویز تعمیر ہوئی-مصر کے ناعاقبت اندیش حکمران اسماعیل نے نہر کی لاگت کے کچھ حصے انگریزوں کو بیچنا شروع کیئے، اس طرح مصر میں انگریزوں کا اثر ورسوخ بڑھنے لگا اور ۱۸۸۳ سے ۱۹۲۲ تک مصر انگریزوں کے زیر اثر رہا۔

۱۸۸۱ میں فرانسیسیوں نے تیونس پر قبضہ کر لیا اور اس کے علاوہ مراکش بھی ان کے قبضہ میں آیا اور ۱۹۳۰ میں فرانس نے ''الجیریا'' پر بھی قبضہ کر لیا۔

۱۹۱۱ میں اٹلی نے حملہ کر کے لیبیا کا کچھ حصہ اپنے قبضہ میں کر لیا اور ۱۹۳۱ میں دوبارہ حملہ کر کے پورے لیبیا کو قبضہ میں لے لیا- جب دوسری جنگ عظیم میں اٹلی کو شکست ہوئی تو لیبیا پر فرانس اور برطانیہ کا قبضہ ہوا، اسی طرح سوڈان پر بھی انگریزوں نے حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور اسے مصر کا ایک صوبہ بنا لیا۔

صومالیہ کو انگریزوں اور اطالویوں نے دو حصوں میں تقسیم کر کے بانٹ لیا تھا، اس طرح افریقہ میں کوئی مسلمان ملک ایسا نہ رہا، جو نوآبادیاتی نظام کے تحت استعمار کے ظلم و جبر کا نشانہ نہ بنا ہو اور اس کے خزانوں اور مال و دولت کو دونوں ہاتھوں سے اہل یورپ نے نہ لوٹا ہو۔ موجودہ یورپ کی یہ بناوٹ اور مال داری، اسی نوآبادیاتی نظام کی مرہون منت ہے، جو انہوں نے پس ماندہ ممالک میں رائج کیا تھا اور ان علاقوں کے وسائل سے استفادہ کیا اور تب تک انہیں نہیں چھوڑا، جب تک ان میں زندگی کی تھوڑی سی رمق باقی رہی اور ان کے خزانوں میں کوئی جگہ اور گنجائش ہوتی رہی۔

(عالم اسلام وسائل و مسائل: ص ۱۱۱، ۱۱۲)

مسلم ممالک افریقہ میں:

ملک کا نام	رقبہ	آبادی	مسلم تناسب
۱-مصر	۱۰۰۱۴۴۹	۴۸۰۰۰۰۰۰	۹۴٪
۲-سوڈان	۲۵۰۵۸۱۳	۲۱۰۰۰۰۰۰	۷۹٪
۳-لیبیا	۱۷۵۹۵۴۰	۳۶۲۰۰۰۰	۱۰۰٪
۴-تیونس	۱۶۴۱۵۰	۶۵۰۰۰۰۰	۹۶٪
۵-الجزائر	۲۳۸۱۷۴۱	۱۸۵۰۰۰۰۰	۹۹٪
۶-المغرب	۴۴۶۵۵۰	۱۹۰۰۰۰۰۰	۹۹٪
۷-موریطانیہ	۱۰۳۰۷۰۰	۱۷۵۰۰۰۰	۱۰۰٪

۸-صومالیہ	۶۴۰۰۰۰	۳۵۰۰۰۰۰	۱۰۰٪
۹-جبوتی	۲۲۰۰۰	۲۰۰۰۰۰	۱۰۰٪
۱۰-سینگال	۲۰۱۰۰۰	۵۰۸۵۰۰۰	۹۵٪
۱۱-گمبیا	۱۱۶۹۵	۶۰۰۰۰۰	۸۵٪
۱۲-گنی	۲۴۵۸۵۷	۴۷۰۰۰۰۰	۹۵٪
۱۳-گنی بساؤ	۳۶۱۲۵	۵۰۰۰۰۰	۸۰٪
۱۴-مالی	۱۲۴۰۷۱۰	۶۳۰۸۰۰۰	۹۰٪
۱۵-بورقینہ فاسو	۲۷۴۲۰۰	۶۹۰۸۰۰۰	۶۴٪
۱۶-ساحل العاج	۳۲۲۴۶۳	۷۰۰۰۰۰۰	۶۰٪
۱۷-ٹوگو	۵۶۰۰۰	۲۴۷۲۰۰۰	۶۰٪
۱۸-بنین	۱۱۲۶۱۲	۲۸۰۰۰۰۰	۶۰٪
۱۹-نائیجیریا	۹۲۳۷۶۸	۶۶۶۰۰۰۰۰	۶۵٪
۲۰-کیمرون	۴۷۵۴۴۲	۸۵۰۳۰۰۰	۶۰٪
۲۱-نائیجر	۱۲۶۷۰۰۰	۴۹۰۰۰۰۰	۹۴٪
۲۲-تشاد	۱۲۸۴۰۰۰	۴۲۰۰۰۰۰	۸۵٪
۲۳-مغربی صحرا	۲۷۱۳۶۰	۱۰۰۰۰۰	۱۰۰٪

۲۴-اریٹریا-اتھوپیا	۱۲۲۱۹۰۰	۳۱۱۰۰۰۰۰	۶۵٪
۲۵-تنزانیہ	۱۰۰۰۰۰۰	۱۶۰۰۰۰۰۰	۶۳٪
۲۶-جزائرقمر	۲۲۳۷	۳۵۰۰۰۰	۸۰٪
۲۷-غانی	۲۳۸۵۳۷	۱۱۴۵۰۰۰۰	۵۰٪
۲۸-سیرالیون	۷۱۷۴۰	۳۴۷۴۰۰۰	۶۵٪
۲۹-موزمبیق	۸۰۱۵۹۰	۱۲۱۳۵۰۰۰	۵۰٪

(عالم اسلام وسائل ومسائل: ص ۴۸، ۴۹)

قبل اس کے کہ جنوبی افریقہ میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ ذکر کی جائے مناسب معلوم ہو رہا ہے کہ براعظم افریقہ میں مسلمانوں کی آبادی کے تناسب پر ایک نظر ڈال دی جائے۔

براعظم افریقہ میں مسلمانوں کا تناسب:

Dwesterman کے بیان کے مطابق ۱۹۵۰ء میں براعظم افریقہ کی کل آبادی ۱۹۸/ملین تھی، جو دنیا کی کل آبادی کا ۲ء۲۱ فی صد ہوتا تھا، جس میں ۶۰/ملین مسلمانوں کی آبادی تھی، گویا ۳ء۳۰ فی صد مسلمان تھے، ۱۹۶۰ء کے اعداد وشمار کے مطابق پورے براعظم افریقہ کی کل تعداد ۲۴۰/ملین تھی، جس میں مسلمانوں کی تعداد ۱۱۵ملین تھی، گویا ۳ء۳۰ سے بڑھ کر دس سال میں ۴۵/فی صد ہوئی، یعنی ۱۵/فی صد کا اضافہ، ۱۹۶۶ء میں کل آبادی ۲۴۵/ملین ہوئی اور مسلمانوں کی تعداد ۱۵۵/ملین ہو کر

کل آبادی ۵۷ر فی صد۔تقریباً ۸ر سال میں مزید ۱۲ر فی صد کا اضافہ ہوا، ۱۹۷۳ء میں U.N.O کے اعداد وشمار کے مطابق کل آبادی ۳۰۳ ملین ہوگئی، جس میں ۲۳۹ر ملین مسلم آبادی تھی، اب ۶۰ء۵ فی صد مسلمانوں کی آبادی ہوگئی جو پورے دنیا کے مسلمانوں کا ۲۶ء۵ فی صد ہوتا تھا۔

۱۹۸۸ء میں براعظم افریقہ کی کل آبادی ۶۱۱ر ملین ہوگئی، جس میں سے ۳۲۳ر ملین مسلمانوں کی آبادی رہی، جو ۵۲ء۸ فی صد ہوتی ہے۔

۲۰۰۳ میں کل آبادی ۸۶۱ر ملین ہوئی، جس میں ۴۱۴ر ملین مسلمان تھے، یعنی مسلمان تناسب کے اعتبار سے تقریباً ۴ر فی صد گھٹ گئے اور ۴۸ فی صد رہے۔

۲۰۰۵ میں ۹۵۶ ملین ہوئی، جس میں ۴۳۳ ملین مسلمان تھے، یعنی ۴۷ء۸ فی صد۔

خلاصہ یہ کہ براعظم افریقہ میں ۱۹۵۰ء سے لے کر ۲۰۰۳ء تک مسلمان بدستور بڑھتے رہے اور دنیا کے تمام براعظموں میں فی صد کے اعتبار سے سب سے زیادہ مسلمانوں کا براعظم افریقہ ہوگیا، البتہ افسوس کی بات یہ ہے کہ آخری دس سال میں مسلمانوں کی تعداد میں کمی واقع ہوئی، اس طور پر کہ ۱۹۷۳ میں ۶۰ فی صد تھی اور اب ۴۷ء۸ فی صد ہوگئی، گویا ۱۲ فی صد کمی واقع ہوگئی۔

اب اس میں ایک احتمال تو مغرب کے غیر منصفانہ اعداد وشمار کا بھی ہوسکتا ہے کہ وہ عمداً مسلمانوں کو کم کرکے بتلا رہے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ مشنری اور نظام تعلیم کے سیکولر ہونے اور غربت کی وجہ سے کچھ کمی ہوئی ہو، جسے سفید فام بڑھا چڑھا کر پیش کررہے ہوں۔

بہر حال دنیا کا تقریباً ایک چوتھائی مسلمان براعظم افریقہ میں آباد ہے، اسی لیے بعض حضرات نے اسے مسلم براعظم افریقہ سے یاد کیا ہے، کیوں کہ اکثریت مسلمانوں کی ہے، گویا تمام براعظموں میں باعتبار نسبت وفی صد کے سب سے زیادہ مسلمان براعظم افریقہ میں ہیں۔ **كثرهم اللّٰه وزادهم ،وخاب كيد الأعداء ومكرهم.**

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں مسلمان کیوں افریقہ میں پائے جاتے ہیں، تو اس کے چند اسباب ہیں:

۱-افریقہ براعظم جزیرۃ العرب سے قریب واقع ہونے کی وجہ سے۔

۲-ابتدائی اسلامی دور ہی میں اسلام کے وہاں پہنچنے کی وجہ سے۔

۳- دور خلیفۂ ثالث ودورِ معاویہؓ میں مصر اور شمالی افریقہ میں اسلامی فتوحات کی وجہ سے۔

۴-مسلمان تاجروں کی آمد ورفت اور حسن اخلاق کی وجہ سے۔

۵-حضرات صوفیا کی دعوتی سرگرمیوں کی وجہ سے۔

۶-عمان کے مسلمان حکمرانوں کے افریقہ کے بعض علاقوں پر حکمرانی کی وجہ سے۔

۷-ہندوستان سے خاص طور پر اور دیگر خطوں سے مسلمانوں کے وہاں پہنچنے کی وجہ سے کہ وہ اپنے دین پر جمے رہے اور دعوتی وتعلیمی سرگرمیاں انہوں نے تیز کردیں۔

۸-بعض داعیوں کی اس علاقے میں محنت کی وجہ سے۔

ہجرت حبشہ اور دروس وعبر:

ہجرتِ حبشہ میں عصر حاضر کے مسلمانوں کے لیے بہت سے درس ہیں۔

۱-مسلمان ہر حال میں اپنے صحیح عقیدہ پر قائم رہیں، چاہے دشمنانِ دین کی طرف سے کیسی ہی سخت مصیبتیں کیوں نہ جھیلنی پڑیں، یہی پکے اور سچے مسلمان ہونے کی علامت ہے، اس کے پیشِ نظر تو صرف اور صرف اللہ کی رضا ہونی چاہیے، کیوں کہ ایمان اور اسلام کی برکت سے روح کو سکون ملتا ہے، چاہے بدن مصائب سے کتنا ہی دوچار کیوں نہ ہو جائے۔

۲-اگر کسی ملک یا بستی میں مسلمان کے لیے حالات بہت زیادہ ابتر ہوں تو اس کے لیے کسی ایسی جگہ ہجرت کرنے کی گنجائش ہے، جہاں اطمینان کے ساتھ دینی شعائر پر عمل کر سکے، جیسا کہ ہجرت حبشہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے کہا تھا کہ حبشہ چلے جاؤ، وہاں کا بادشاہ ''**لا يظلم عنده أحد**'' نہ کسی پر ظلم کرتا ہے اور نہ ظلم ہونے دیتا ہے، داعیوں کے لیے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ رہنمائی ہے کہ مسلمانوں کو جب شدید خطرے میں دیکھیں تو محفوظ مقام پر نقل مکانی کا حکم دے دیں۔

۳-ہجرت حبشہ سے یہ بھی سبق ملتا ہے کہ مسلمان (خاص طور پر داعی اور ذمہ دار) ہمیشہ دین اسلام کی نشر واشاعت کے لیے فکرمند رہیں، اگر کہیں پر دشواری آئے تو دوسری مناسب جگہ ایسی تلاش کریں جہاں دین کی دعوت عام ہو سکے، تاکہ دعوت کا دوسرا مرکز تیار ہو جائے۔

۴-ہجرتِ حبشہ کے موقع پر پہلے حضرت جعفرؓ ابن ابی طالب کی شرکت اور پھر دوسری مرتبہ حضرت عثمانؓ اور حضرت رقیہؓ کی شرکت یہ بتلاتی ہے کہ مسلمانوں کے جو قائد ہوں، ان کے اقربا کسی بھی طرح کی قربانی کے موقع پر ضرور شامل ہونے چاہیے، تاکہ لوگوں پر اس کا عمدہ اثر ہو۔

۵-دین اسلام کے تحفظ کے خاطر وطن کی قربانی ہجرت حبشہ سے ثابت ہوتی ہے کہ چاہے کتنا ہی مقدس مقام کیوں نہ ہو؛ لیکن اگر وہاں دین محفوظ نہیں تو وہاں رہنے کا کوئی مطلب نہیں، لہٰذا اسے چھوڑ کر امن اور سکون کی جگہ تلاش کرنی چاہیے اور وہاں ہجرت کر لینی چاہیے، جیسا کہ صحابہؓ نے مکہ جیسے مقدس وطن کو بھی محض تحفظِ دین کی خاطر خیر آباد کہہ دیا، بل کہ اسی سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ''دار الکفر'' سے ''دارالکفر'' کی طرف ہجرت بھی بدترین حالات میں مشروع اور جائز ہے، یعنی ''دارالکفر'' کی قسم ''دارالحرب'' سے ''دارالامن'' کی طرف جیسا کہ صحابہؓ نے مکہ سے -جو اس وقت ''دارالحرب'' تھا- حبشہ جو ''دارالامن'' تھا کی طرف ہجرت کی۔

عصر حاضر کے مسلمانوں کا ایک بڑا مسئلہ یہی ہے کہ کیا وہ ''دارالکفر'' کی طرف ہجرت کر سکتے ہیں؟ تو ہجرت حبشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی مسلمان کا ''دارالکفر'' وطن ہو اور اسے وہاں دینی دشواریاں درپیش ہوں تو اسے ترک کر کے کسی ''دار الاسلام'' یا ایسے ''دار الکفر'' یعنی ''دار الامن'' کی طرف ہجرت کر لینی چاہیے، جہاں دین پر عمل آسان ہو، لہٰذا عصر حاضر کے مسلمانوں کے لیے یہ مقامِ غور

ہے کہ وہ مختلف غیر اسلامی ریاستوں کی طرف تحفظ دین کے خاطر نقل مکانی کر لیتے ہیں یا غرض مال کمانا اور تجارت ہوتی ہے، یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمان اسی جگہ ہجرت کر سکتا ہے جہاں اسے اپنے دین پر عمل کرنے کی آزادی حاصل ہو اور اگر کوئی مسلمان کسی ایسے ملک کی طرف ہجرت کرے، جہاں اس کے لیے دین پر عمل کرنا پہلے کے مقابلہ میں دشوار ہو تو محض تجارت یا مال کمانے کے لیے وہ ہجرت نہیں کر سکتا، کیوں کہ اس کا اور اس کی نسل کا دین وہاں محفوظ نہیں، حضرات صحابہؓ نے مکہ جیسے مقدس شہر کو دین کی خاطر ترک کیا تھا، تجارت وزراعت کے لیے نہیں!!

٦- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حبشہ کے حالات سے واقف ہونا ثابت کرتا ہے کہ مسلمان قائد اور عالم کو دنیا کے احوال سے باخبر رہنا بھی ضروری ہے، تاکہ دین پر عمل میں دشواری کی صورت میں پر امن مقام کا انتخاب کر کے وہاں ہجرت کر سکے۔

٧- ہجرتِ حبشہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کا راز داری کے ساتھ پلاننگ کرنا بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حبشہ پہنچے وہاں تک قریش کو ہوا بھی نہ لگ سکی کہ مسلمان حبشہ جا چکے ہیں، بعد میں معلوم ہوا، گویا مسلمان کو بیدار مغز، صاحب فراست اور دور اندیش ہونا چاہیے، غفلت، سستی، بے جا بھولا پن اور نفاق سے مسلمان کو پاک ہونا چاہیے۔

٨- کسی مسلمان پر جب کوئی عمومی حادثہ پیش آئے تو باہم مشورہ سے ذہین افراد کی رائے معلوم کر کے اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے اور بجائے آپسی اختلاف کے کسی ایک رائے پر متفق ہو کر، کسی ذہین وفطین، سمجھ دار و دیانت دار آدمی کو امیر بنا کر اسے آگے کرنا چاہیے، جیسا کہ صحابہؓ نے حضرت جعفرؓ کو نجاشی کے پاس جانے سے پہلے آگے کیا۔

٩- جسے ذمہ دار بنایا جائے، اسے بڑی حکمت ومصلحت سے کام لینا چاہیے، اس طور پر کہ حق کا دفاع بھی ہو سکے، حق کا پیغام بھی پہنچایا جا سکے اور اعتراض کرنے والے کو مطمئن بھی کیا جا سکے، نیز مدِّ مقابل کی چالاکی اور مکاری کا توڑ بھی ہو سکے اور ثالثی کرنے والے پر بھی اس کا عمدہ اثر مرتب ہو سکے، جیسا کہ حضرت جعفر ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کیا کہ زمانۂ جاہلیت کے بدترین احوال اور پھر ایسے حالات میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوتِ اسلامی اور حسن اخلاق جس نے معاشرہ میں بھلائی کی روح پھونک دی اور قریش کا محض اندھی تقلید میں آپ کی مخالفت کرنا، انصاف پسند لوگوں پر قریش کا ظلم، پھر سورۂ طٰہٰ کا مؤثر انداز میں پڑھنا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حکمت آمیز اور انتخابِ الفاظ کی مدد سے ثالثی کرنے والے کو مطمئن کر دینا۔ آپ نے کہا ”**عیسیٰ بن مریم كلمة اللّٰه وروحه ألقاها إلى مريم البتول الطاهرة** “ ایسی عبارت منتخب کی کہ ثالثی کرنے والا بھی مطمئن ہو گیا۔

۱۰-مسلمان اگر کسی پُر امن مقام پر ہوتو بڑی حکمت سے کام لینا چاہیے، جذبات پر کنٹرول رکھتے ہوئے موقع ومحل کے اعتبار سے ایسا عمدہ موقف اختیار کرنا چاہیے کہ نہ دینی اعتبار سے نقصان ہو اور نہ سکونت کے اعتبار سے۔

جاننا چاہیے کہ مذکورہ صفات اللہ مسلمانوں میں خود ہی پیدا کر دیتے ہیں، جب مسلمان اپنی زندگی کا مقصد اللہ کی رضا بنالے کہ بس ہر حال میں میرا رب مجھ سے راضی رہے۔

واقعۂ ہجرتِ حبشہ کا مطالعہ عصر حاضر کے مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوسکتا ہے کہ وہ اسلام کی غربت اولیٰ تھی اور یہ غربت ثانیہ ہے، جیسے انہوں نے غربت اولیٰ میں کامیابی حاصل کی، آج ہم بھی ان کے نقشِ قدم پر غربتِ ثانیہ میں کامیابی سے ہم کنار ہوسکتے ہیں۔

جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی تاریخ:

جنوبی افریقہ میں اسلام کی تاریخ جاننے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ جنوبی افریقہ کا اطلاق ایک تو جغرافیائی اعتبار سے براعظم افریقہ کے جنوب میں واقع اس خطہ پر ہوتا ہے جو چند ملکو ں پر مشتمل ہے، جس کا پیچھے تذکرہ ہو چکا (۱)بوٹسوانا (۲)لیسوتھو(۳)نمیبیا(۴)ساؤتھ افریقہ(۵)سوژرلینڈ(۶)ملاوی(۷)زامبیا(۸) زمبابوے اور دوسرے جنوبی افریقہ ایک مستقل ریاست اور ملک کا نام ہے،اس وقت اسی کا تذکرہ مقصود ہے کہ اسلام وہاں کب اور کیسے پہنچا، کیوں کہ اس ناچیز نے جنوبی افریقہ نامی ملک کا سفر کیا اور اسی کا سفرنامہ سپردِ قرطاس کر رہا ہے۔

جنوبی افریقہ کا سفر چوں کہ تین ماہ کے عرصہ میں دو مرتبہ پیش آیا، پہلی مرتبہ اواخرِ شعبان میں اور دوسری مرتبہ اوائل ذوالقعدہ میں اور بندہ پہلے سفر کے دوران ہی سفرنامہ لکھنے کا ذہن بنا چکا تھا، بل کہ لکھنا بھی شروع کر چکا تھا، دوسرے سفر سے قبل دو قسطیں ’’شاہراہِ علم‘‘ میں شائع ہوچکی تھیں۔ دوسرے سفر کے دوران براعظم افریقہ کے سب سے قدیم اور عظیم، بل کہ مقبول ادارے ’’دارالعلوم زکریا‘‘ میں حاضری کا موقع ملا، جہاں حافظ بشیر باٹھیا اور ان کے صاحبزادے سے ملاقات ہوئی، میں نے عرض کیا کہ جنوبی افریقہ میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ پر مواد درکار ہے تو فوراً ماشاء اللہ موصوف نے انگریزی میں چند مقالات لاکر دیئے، جن سے آئندہ حصہ میں استفادہ کیا جائے گا، اللہ موصوف کو اجرِ عظیم سے نوازے۔ آمین

براعظم جنوبی افریقہ تقریباً ۸/ریاستوں پر مشتمل ہے، جہاں مسلمانوں کا تناسب کچھ اس طرح ہے:

ملاوی میں ۲۹فی صد
نمیبیا میں ۴/فی صد
لیسوتھو میں ۳/فی صد
زامبیا میں ۳/فی صد
سوژرلینڈ میں ۳/فی صد
جنوبی افریقہ میں ۲/فی صد
زمبابوے میں ۱۰/فی صد
بوٹسوانا میں نصف/فی صد

گویا جنوبی افریقہ میں مشرقی، شمالی، وسطی اور مغربی افریقہ کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد کم ہے، تقریباً چالیس لاکھ اور فی صد کے اعتبار سے ۷؍فی صد؛ مگر الحمدللہ! دینی اور اقتصادی حالت قدرے بہتر ہے۔

براعظم جنوبی افریقہ میں اسلام:

جیسا کہ گزر چکا ہے تقریباً ۸؍ریاستوں کے مجموعہ پر براعظم جنوبی افریقہ کا اطلاق ہوتا ہے، میں نے یہ تلاش کرنے کی کوشش کی کہ جنوبی افریقی ریاستوں میں سب سے پہلے اسلام کہاں پہنچا تو سید عبدالمجید بکر کی کتاب " **الأقليات المسلم في أفريقيا** " کے صفحہ ۱۷۳؍پر یہ لکھا ہوا پایا" **وصل الإسلام إلى هذه المنطقة مبكرا، فلقد عشر دكتور ستانلي تيمبور على قبر في أراضي زمبابوے على مقربة من نهر ز مبيري، وقد نقش عليه: بسم الله الرحمن الرحيم، لا إله إلا اللّٰه محمد رسول الله، هذا قبر سلام بن صالح الذي انتقل من دار الدنيا إلى دار الاخرة، في السنة الخامسة والتسعين من هجرة النبي عليه الصلاة والسلام.**

اسلام ریاستِ زمبابوے میں اپنے دورِ آغاز ہی میں پہنچ چکا تھا، کیوں کہ پروفیسر ستانلی تیمبور کی تحقیق کے مطابق زمبیری کے قریب ایک قبر پر لکھی ہوئی تختی پائی گئی، جس میں بسم اللہ اور کلمۂ طیبہ کے بعد لکھا تھا، یہ سلام ابن صالح کی قبر ہے، جو دار فانی سے دار باقی کی طرف ۹۵ھ میں رحلت فرما گئے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افریقہ کے جنوب میں اسلام قرن اول ہی میں پہنچ چکا تھا، خاص طور پر زمبابوے کے علاقہ میں۔

براعظم افریقہ کے جنوب میں واقع ۸؍ریاستوں میں سب سے زیادہ مسلمان ۲۹؍فی صد ملاوی میں ہیں، جو ۶۰؍فی صد سے گھٹ کر ۲۹؍فی صد ہوگئے ہیں، کیوں کہ عیسائی مشنریاں بہت زور شور سے کام کر رہی ہیں، دوسرے نمبر پر زمبابوے میں ۱۰؍فی صد، اس کے بعد زامبیا میں تقریباً ۳؍فی صد، نمیبیا میں ۴؍فیصد لیسوتھو میں ۳؍فی صد، سیوزی لینڈ میں ۳؍فی صد، جنوبی افریقہ میں ۲؍فی صد اور بوٹسوانا میں نصف فی صد۔

وصول اسلام کی ترتیب:

پہلے زمبابوے، پھر ملاوی، پھر زامبیا، اس کے بعد جنوبی افریقہ، اس کے بعد سیوزی لینڈ، اس کے بعد بوٹسوانا، پھر نمیبیا اور لیسوتھو میں اسلام پہنچا۔

یہاں احقر کو ایک خلجان ہے اور وہ یہ کہ اسلام جنوبی افریقہ کے تمام پڑوسی ملکوں میں اسلام کے ابتدائی دور میں پہنچا مثلاً: زمبابوے، زامبیا، لیسوتھو، پھر جنوبی افریقہ میں اسلام گیارہویں صدی عیسوی میں کیوں پہنچا؟ یہ امر قابل تحقیق ہونا چاہیے کہ ملیشیائی مسلمانوں کی آمد کو جو جنوبی افریقہ میں اسلام کے دخول کا مصداق ٹھہرایا جارہا ہے شاید درست نہ ہو؛ کیوں کہ جب پڑوسی ملک موزمبیق میں اسلامی حکومت قائم ہوئی اور ایک تحقیق کے مطابق موزمبیق میں مسلمانوں کی تعداد ۹۰؍فی صد تھی، جو ارتداد سے کم ہوکر ۴۰؍فی صد کو پہنچ گئی تو کیا ان مسلمان حکمرانوں، داعیوں اور علما

وتجار نے اسلام جنوبی افریقہ میں پہنچانے کی کوشش نہیں کی ہوگی ! دوسری جانب زمبابوے میں بھی قرنِ اول سے ہی اسلام کے آثار موجود تھے، اسی طرح ملاوی میں باقاعدہ اسلامی حکومت قائم ہوئی تو ظاہر سی بات ہے ضرور مسلمان اسلام کی دعوت لے کر وہاں پہنچے ہوں گے، میں تقریباً پانچ ماہ تک کتابوں اور انٹرنیٹ پر اس کا سراغ لگاتا رہا؛ مگر کہیں اس کے بارے میں معلومات حاصل نہ ہوسکیں، سب نے گیارہویں صدی ہجری اور سترہویں صدی عیسوی میں اسلام کے وہاں پہنچنے کا تذکرہ کیا ہے؛ البتہ الدکتور احمد النحانی نے ''**الأقلية المسلمة في دول جنوب أفريقيا**'' کے عنوان سے ''**شبكة الألوكة**'' میں مختصر اشارہ دیا ہے۔

انتشار الإسلام في جنوب أفريقيا:

''كانت الموجة الأولى عن طريق تسرب الإسلام من'' سفالة'' أشهر المراكز الحضارية الإسلامية في الشرق الأفريقي إلى السواحل الجنوبية للقارة الأفريقية، حيث انتقل إلى مايعرف حاليا بدولة ملاوي، ومنها انطلق إلى أعماق جنوب أفريقيا ''

احتفظ التجار العرب بحرية الانتقال من'' سفالة'' إلى ملاوي وصولاً إلى رأس الرجاء الصالح.

احمد النحانی لکھتے ہیں کہ مشرقی افریقہ میں واقع ''سفالۃ'' سے اسلام کیپ ٹاؤن ہوتا ہوا ملاوی پہنچا؛ ''سفالۃ'' افریقہ میں اسلامی تہذیب وتمدن کا سب سے مشہور گہوارہ ہے اور پھر ملاوی سے جنوبی افریقہ کے دیگر علاقوں میں پہنچا۔

مسلمان عرب تجار ''سفالۃ'' سے ملاوی، کیپ ٹاؤن ہوتے ہوئے گئے تھے، اسی سے معلوم ہوا کہ اسلام بہر حال جنوبی افریقہ میں قرون اولی ہی میں پہنچ چکا تھا۔ **واللہ أعلم بحقيقة الحال !**

یہاں کوئی یہ سوال کرسکتا ہے کہ اگر اسلام پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا تو اس کے آثار کیوں نہیں ہیں؟ مثلاً مساجد وغیرہ، کیوں کہ مسلمان جہاں بھی پہنچا، اس نے اپنے آثار اور خاص طور پر مساجد ضرور چھوڑی ہیں۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے آثار ہوں؛ مگر اب تک ان کا علم نہ سکا ہو، یا قلت کی وجہ سے انہوں نے کوئی عبادت خانہ یا مسجد نہ بنائی ہو، یا اب تک تو وہ غریب غیر متمدن ملک رہا ہے، اب سے تقریبا دوسو سال قبل جب سونے کا ظہور ہوا تب وہاں تمدن آیا تو جس طرح ان کے مکانات کچے تھے ویسے ہی مساجد بھی کچی ہی رہی ہوں، جو باقی نہ رہ سکی ہوں۔

بہر حال مجھے اس پر اصرار نہیں ہے، البتہ قرائن سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان یا تو بہت پہلے وہاں پہنچے ہوں گے یا جنوبی افریقہ کے نام سے الگ ریاست کا وجود بہت بعد میں ہوا ہو اور یہ مختلف شہر کیپ ٹاؤن وغیرہ قدیم روڈیشیا شمالی یا جنوبی کا حصہ رہے ہوں، جس میں اول الذکر کو اب زامبیا اور ثانی الذکر کو زمبابوے کہا جاتا ہے؛ البتہ مغربی مؤرخین جنوبی افریقہ کی تاسیس سنہ عیسوی دو میں قرار دیتے ہیں کہ شمالی افریقہ سے بڑے پیمانے پر لوگ ہجرت کر کے یہاں پہنچے، یعنی آج سے تقریباً ۱۷سو سال قبل، اسلام کے آنے سے تقریباً چار سو سال پہلے؛ مگر یہ سب اندازے ہیں، کوئی دلیل ان پر نہیں۔ **و اللہ أعلم بحقيقة الحال !**

جنوبی افریقہ میں مختلف العرق مسلمان:

جنوبی افریقہ میں مختلف العرق مسلمان آباد ہیں۔

۱-سیاہ فام مسلمان ۔۲-سفید فام مسلمان ۔۳-ہندوستانی مسلمان ۔۴-انڈونیشیائی مسلمان۔۵-مختلف اسلامی وغیر اسلامی ممالک سے آکر بسنے والے مسلمان، مثلاً: پاکستانی مسلمان، بنگلادیشی مسلمان وغیرہ۔

تعداد کے اعتبار سے سب سے زیادہ مسلمان ہندوستانی ہیں اور ہندوستانی میں بھی گجراتی اور گجراتی میں بھی اکثریت سورت اور بلساڑ کے علاقہ کے مسلمانوں کی، اس کے بعد کاٹھیاواڑی میمن مسلمان اور بھروچ وغیرہ کے گجراتی مسلمان بھی تو اب ہم تفصیل سے ان شاء اللہ اس پر گفتگو کریں گے۔

تفصیلی گفتگو سے قبل جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی ۳۵۰ سالہ تاریخ کا مختصر خاکہ انگریزی سے اردو ترجمہ مولانا شمس الہدی صاحب کے شکریہ کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

جنوبی افریقہ میں اسلامی تاریخ وتہذیب:

چارادوار پر محیط جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی ۳۵۰ سالہ مختصر تاریخ

(ڈچ، برطانیہ، افریقن اور موجودہ جمہوریت)

(۱) جنوبی افریقہ میں سب سے پہلے مسلمان ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے ذریعے تقریبا 1654 میں لائے گئے، جب انہوں نے جلاوطن لوگوں، غلاموں، سیاسی قیدیوں اور مجرموں کے لیے ''کیپ آف گڈ ہوپ'' کو بطور رہائش کے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا، اس وقت اکثر مسلمان ہندوستانی خصوصا بنگالی مجاہدین آزادی تھے، نیز سری لنکا، انڈونیشیا اور مالابار کے لوگ تھے۔ باتاویا (Batavia) کے ابراہیم نامی شخص جو'' جن ون ری بیک'' (Jan Van Riebeeck) کے ساتھ آئے، کہا جاتا ہے کہ وہ افریقہ کی زمین پر قدم رکھنے والے پہلے مسلمان ہیں۔

(۲) کیپ میں ابتدائی آزاد مسلمان 1658 میں ''مولوکا'' جزیرے سے آئے جنہیں آزاد سمجھا جاتا تھا، یہ مسلمان کیپ کی حفاظت کے لیے بطور مزدور لائے گئے۔ بہر حال اس وقت مسلمانوں کے لیے کھلم کھلا اسلام پر عمل اور اس کی تبلیغ ممنوع تھی ؛لیکن وہ عیسائی بن سکتے تھے، انہیں پلاکاٹ (Placaat) کے قوانین کے مطابق سزائے موت دی جاتی، اگر وہ عیسائیوں کو اسلام کی طرف بلاتے اور کھلم کھلا اسلام کی تبلیغ کرتے۔

(۳) 1694 میں جاوا (Java) کے سیاسی کارکن توان یوسف (Tuan Yusuf) اوران کے حواریین کی آمد کے بعد اسلام کو متحرک وفعال زندگی ملی، انہیں کیپ ٹاؤن سے 36 میل دور فارم ''زیٹ ویلی'' (Zietvlei) میں رکھا گیا۔

بہر حال ان کی وفات کے بعد ان کے حواریین کو واپس بینٹام (Bantam) بھیج دیا گیا اور اس طرح سے مسلمانوں کی پہلی نو آبادی کا اختتام ہو گیا۔

(۴) دوسری اور زیادہ مستحکم مسلم نو آبادی بوکاپ (Bo-Kaap) میں ۵۰ سال بعد وجود میں آئی، جسے جنوبی افریقہ میں اسلام کا مادر وطن سمجھا جاتا ہے۔ اکثر مالیز (Malays) باشندوں نے آزادی حاصل کر لی اور ان کے پاس مالیز اور اسلامی تہذیب کو پیش کرنے کا موقع تھا، وہ کھانا پکانے، مکانوں کی تعمیر اور سلائی کی صلاحیتوں کے لیے جانے جاتے تھے، ان کی زبان اور تہذیب نے افریقن کو بطور زبان ابھرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

(۵) کیپ ٹاؤن پر برطانوی قبضے کے خلاف ڈچ قوم کے لیے مسلمانوں کی جانب سے جنگی خدمات فراہم کرنے کے بدلے میں مسلمانوں کو مسجد کے لیے پہلی جگہ حاصل ہوئی۔ ابتدائی کامیابی کے بعد 1806 میں بلا برگ (Blaawberg) کی جنگ میں ڈچ قوم کو پسپائی ہوئی اور کالونی پر قبضہ ہو گیا، تاہم لارڈ بیرڈ (Lord Baird) نے جنسین (Janssen) کے وعدے کی پاس داری کی اور مسجد کی جگہ مسلمانوں کو ان کی بہادری کے عوض انہیں دے دی گئی۔

(۶) 1794 میں اول مسجد (Auwal Masjid) کی تعمیر بوکاپ کی ڈورپ گلی 42-43 میں اسی مقام پر ہوئی، سارٹ جی (Saartjie Van de Kaap) خاتون کا کردار اس سلسلے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے، اس نے اپنی جائداد اس مسجد کی

تعمیر کے لیے وقف کر دی، مسجد کے پہلے امام عبد اللہ قاضی عبد السلام تھے جو ٹوان گرو (Tuan Guru) کے نام سے مشہور تھے، وہ پہلے معلم بھی تھے، ان کے بعد 1825 میں ان کے شاگرد عظمت ون بنگالن (Achmatvan Bengalen) استاذ مقرر ہوئے۔ اس وقت اس مسلم اسکول میں 491 طلبہ کا اندراج تھا۔

(۷) ''ٹوان گرو'' جو Tanate جزیرے میں Tidone کے شہزادہ تھے انہوں نے ہی شافعی فقہ کو کیپ میں متعارف کرایا، انہوں نے ہی اپنی یادداشت سے قرآن کریم اور دیگر اہم اسلامی کتابوں کو اپنے ہاتھ سے لکھا، مسجد کی تعمیر سے پہلے ہی انہوں نے کھلی فضا میں جمعے کی نماز شروع کر دی تھی۔

(۸) جب اسلام کو 1804 میں سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا تو خصوصا 1883 کے قانون صحت عامہ اور 1886 کے قبرستان کے تنازعات کے خلاف یہ مسجد احتجاج و مظاہرے کا مرکز بن گئی۔

(۹) 1873 میں برطانوی حکومت کی درخواست پر کیپ (Cape) میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے سرکاری طور پر ترکی حکومت نے ابوبکر آفندی کو بھیجا۔ حنفی فقہ پر ان کی کتاب ''بیان الدین'' افریقن عربی زبان میں لکھی گئی اور 1873 میں عثمانیہ حکومت نے بطور ہدیہ اس کتاب کو شائع کیا، ان کے لڑکے عظمت پہلے شخص تھے جنہوں نے جنوبی افریقہ کی سیاست میں قدم رکھا اور 1894 کے انتخابات میں حصہ لیا۔ برطانوی لوگ اتنے چوکنا تھے کہ انہوں نے پارلیمنٹ میں مسودۂ قانون پیش کیا؛ تاکہ ان کو 1894 کے انتخابات میں حصہ لینے سے روکا جا سکے۔

(۱۰) 1870 کی دہائی میں نٹال (Natal) بندرگاہ پر ہندوستانی مسافروں کی آمد نے - جو اکثر مسلمان تھے-مسلم سماج کو ایک نئی ترقی ونمو عطا کی، ان میں سے اکثر نے اندرون ملک تجارت اختیار کرلی۔

(۱۱) 1873 اور 1880 کے درمیان برطانوی حکومت غلاموں کو عوامی کاموں کے لیے بطور مشروط مزدور کے نٹال (Natal) میں لائی، ان میں اکثریت ہندوستانی نیز مشرقی افریقہ، ملاوی، موزمبیق ،زامبیا اور صومالیہ کے لوگ بھی تھے، وقت کے ساتھ انھوں نے آزادی حاصل کرلی اور ان کو زراعتی زمینیں دی گئیں۔

(۱۲) 4/اگست 1873 کو 113 آزاد غلاموں کی ایک دوسری کھیپ نٹال (Natal) بندرگاہ پر آئی، افریقہ کے مشرقی ساحل سے ان غلاموں کی منتقلی 1880 تک جاری رہی۔ 1877 تک تقریباً 500 مسلمان ڈربن کے علاقے King Rest میں رہائش پذیر ہوچکے تھے، انہیں ''زنزباری'' کہا جاتا تھا کیوں کہ وہ زنزبار جزیرے سے نٹال بندرگاہ آئے تھے۔

(۱۳) مسلمان 1880 کے بعد ٹرانسوال (Transvaal) میں داخل ہوئے اور تجارت کو اپنا پیشہ بنایا اور کچھ معمولی ہاکرز (پھیری والے) بن گئے۔ بعد کے دنوں میں جوہانسبرگ میں سونے کے انکشاف نے مسلمانوں کو اس شہر کی طرف مائل کیا۔ ان کی اکثر تجارتیں پری ٹوریا (Pretoria) اور جوہانسبرگ میں تھیں؛ لیکن تجارتی مواقع نے ان کو چھوٹے قصبوں کی طرف متوجہ کیا، جہاں وہ کالوں اور دیہاتوں کے ساتھ تجارت میں مشغول ہوگئے، انہوں نے تجارتی ڈائریکٹریوں میں اشتہار بھی دیا اور اس مقصد کے لیے انہوں نے 1907 سے 1910 تک ''الإسلام'' شائع کیا۔

(۱۴) 15/جولائی 1896 کو جب پہلی مردم شماری ہوئی تو اس وقت مرکزی شہر سے 4 سے 8 کلومیٹر کے دائرے میں جوہانسبرگ کی آبادی درج ذیل تھی: 50907 گورے لوگ، 42533 کالے لوگ، 4807 ایشیائی لوگ، 2879 مختلف رنگ کے لوگ اور 952 مالیز لوگ تھے۔

(۱۵) نٹال اور ٹرانسوال میں ہندوستانی مسلمانوں کو ان کی آمد سے ہی مذہبی آزادی حاصل تھی اور وہ اپنے ادارے قائم کرسکتے تھے، ملک کے شہروں اور قصبوں کے بیچ مدرسوں اور مسجدوں کا وجود اس بات کا ثبوت ہے۔

(۱۶) ٹرانسوال کے مختلف حصوں میں مسلم تاجروں کی موجودگی یورپی تاجروں کے لیے ایک خطرہ بن گئی، ان کا مسلم تاجروں سے کوئی مقابلہ نہ رہا، انہوں نے حکومت کو عرضی دی کہ اس سلسلے میں سخت اقدامات کئے جائیں، اس کے ردعمل میں ہندوستانی امیگریشن (ترک وطن) کو سختی سے کنٹرول کیا گیا اور ایشیائی بازار کی فکر زیر بحث آئی۔

(۱۷) 1907 میں ہندوستانیوں کو نٹال سے ٹرانسوال منتقل ہونے یا سفر کرنے کے لیے اجازت لینی نہیں پڑتی تھی، اسی سال ترمیمی قانون کے ذریعہ تمام ہندوستانیوں کو باشندے کے طور پر درج کرانا ضروری ہوگیا، گاندھی جی جنہوں نے ہندوستانی تاجروں کی غیرمشروط حمایت حاصل کرلی تھی ان کی رہنمائی میں ہندوستانیوں نے غیرمتشدد مزاحمت کا آغاز کیا اور بغیر لائسنس کے اپنی تجارتیں جاری رکھیں، گاندھی جی کو جیل میں ڈال دیا گیا اور مہم ختم کرنے کے لیے متعدد انسدادی اقدامات کئے گئے۔

(۱۸) زمین پر قبضے کا قانون ملکیت اور قبضے کو روکنے کے لیے ناکافی تھا، اس لیے 1948 میں قانون سازی سے اسے تبدیل کر دیا گیا، اس سے نہ صرف ترقی سست پڑ گئی بل کہ توسیع کو بھی اس نے ناممکن بنا دیا۔

(۱۹) نٹال میں، 1890 میں تجارتی سہولتوں اور تجارتی حقوق کے مسائل کو اٹھانے کے لیے ''انڈین کمیٹی ڈربن'' کی تشکیل ہوئی، مسلمانوں کے زیر انتظام اس تنظیم نے ''نٹال انڈین کانگریس'' کو جنم دیا۔ 1903 میں کیپ ٹاؤن میں ''ساؤتھ افریقن مسلم ایسوسی ایشن'' کی تشکیل ہوئی جس کا مقصد غیر گورے لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ اسکولوں کی حمایت تھا۔

(۲۰) انیسویں صدی کے آخر میں ٹرانسوال میں ''مدرسہ انجمن اسلامیہ کھولوڈ'' کا قیام عمل میں آیا، تقریباً 1895 میں اس تنظیم نے مالے کیمپ، فیری راس ڈورپ اور جوہانسبرگ میں زمینیں خریدیں، تا کہ کرایے کی آمدنی کا استعمال گجرات میں کھولوڈ مدرسے کے تعاون کے لیے کیا جا سکے۔ 1906 میں مسلم تاجروں کی ایک تنظیم ''حمیدیہ اسلامک ایسوسی ایشن جوہانسبرگ'' کا قیام عمل میں آیا۔ اس تنظیم کا مقصد تمام ناانصافیوں کی مخالفت کرنا تھا، مسلم عدالتی مجلس کا قیام 1945 میں ہوا جب کہ ''جمعیۃ علمائے نٹال'' 1950 میں قائم ہوئی۔

(۲۱) ''جمعیۃ علمائے ٹرانسوال'' کا قیام 1923 میں ہوا اور 1935 میں اسے اس وقت زندگی ملی، جب ''میاس فارم''(Mias Farm) ٹرانسوال میں قائم ہوا، جہاں مفت اسکولی تعلیم اور مکمل دار الاقامہ کی سہولت کے ساتھ مدرسہ کا قیام ہوا، اس

ادارے نے پورے ملک کے مسلمانوں کی خدمت کی۔ 1952 میں ''سینٹرل اسلامک ٹرسٹ'' کا قیام سماجی فلاح عامہ اور تدفین و تکفین کی رہنما تنظیم کے طور پر عمل میں آیا۔

(۲۲) مسلمانوں کی پہلی بغاوتی مہم 17/جنوری 1886 کو مشہور علما اور اماموں کا تاریخی قبرستان (Tana Baru) کو ختم کرنے کے رد عمل میں وجود میں آئی، تقریباً 3000 مسلمانوں نے کیپ ٹاؤن کی گلیوں میں پُرسکون احتجاج کیا، جب کہ نٹال میں مزاحمت رجسٹریشن کے سلسلے میں تھی، مسلمانوں نے پُر امن مزاحمتی مہم میں گاندھی جی کا ہاتھ تھام لیا۔

(۲۳) موجودہ معلومات کے مطابق ٹرانسوال میں سب سے پہلی مسجد کرک اسٹریٹ(Kerk Street) کی مسجد تھی، مسجد کے لیے زمین 1870 میں حاصل کی گئی اور نمازیں خیمے میں ادا کی جاتی تھیں، جو بعد میں ٹین کی عمارت میں تبدیل کر دی گئی۔ سرکاری دستاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ ''جامع مسجد'' 5/اپریل 1888 کو تحویل کے ذریعہ حاصل کی گئی، سند تحویل نمبر 3524 ہے۔

(۲۴) ٹرانسوال میں ابتدائی علما ''مالیز'' تھے جیسے امام طیب جامی، امام خلیل، امام عبد الملک، امام اسماعیل اور امام اسماعیل جامی تھے، یہ امام ہندوستانی علما جیسے مولانا سید احمد مختار کے ذریعے لائے گئے۔ ابتدا میں ٹرانسوال آنے والے علما میں مولانا تجمل حسین، مولانا بھام اور مولانا سلیمان اٹالوی (سورتی) تھے، اس کے بعد مفتی بسم اللہ، مولانا اکرام الدین، مولانا اسماعیل اٹالوی، مولانا محمد شاہ، مولانا ولی اللہ، قاری عبد الصمد بھوپالی، مولانا اسماعیل کفلیتوی اور مولانا فتح محمد علی پوری تھے۔

(۲۵) استعماری اورنسلی عصبیت والی حکومت کوختم کرنے کے لیے کچھ مسلمانوں نے ''افریکن نیشنل کانگریس'' اوراس سے ملحقہ تنظیموں سے ہاتھ ملالیا، جب کہ دوسرے مسلمانوں نے آزادانہ جدوجہد شروع کی۔ ان میں مشہور وممتاز ڈاکٹر یوسف داؤد، احمد تمول، احمد کتھرادا، مولوی کچالیا، ببلا سلوجی، ڈاکٹر رشید احمد محمود سلوجی، ڈاکٹر یوسف جسات، اسماعیل میر اور امام عظمت قاسم تھے۔بعض کو جیل ہوئی اور کچھ جلاوطن ہوگئے، جب کہ بے شمار لوگوں نے انصاف کی خاطر اپنی جانیں قربان کردیں، بشمول امام عبداللہ ہارون اوردوسرے افراد پولیس کی تحویل میں قتل کردیئے گئے۔

(۲۶) ڈربن یونی ورسٹی 1970 میں ہندوستانیوں کے لیے نسلی عصبیت کی حکمت عملی کے تحت قائم کی گئی، تمام ہندوستانیوں کو پورے ملک سے اعلیٰ تعلیم کے لیے ڈربن کا سفر کرنا پڑتا تھا، اساتذہ کے لیے تربیتی کالجز نسلی بنیاد پر متعلقہ تعلیمی محکموں کے ذریعے چلائے جارہے تھے، طلبہ کو ان کورسیز اور ڈگریوں کے حصول کے لیے جو قبائلی یونی ورسٹیوں میں موجود نہ تھے وزارت سے اجازت حاصل کرنی پڑتی تھی، مثال کے طور پر ''وِٹ واٹرس رینڈ یونی ورسٹی'' میں میڈیکل کی سیٹ کے لیے وزارت کی اجازت ضروری تھی۔

(۲۷) 1980 کی دہائی میں بڑے پیمانے پر مدارس اور پرائیویٹ مسلم اسکولوں کا ظہور ہوا، جو علاحدہ نسلی قوانین کے تحت رجسٹرڈ کئے گئے، یہ اسکولز بنیادی طور پر گروپ علاقوں میں قائم کیے گئے، اور آج ساؤتھ افریقہ میں ۶۰ ٪ سے زیادہ مسلمانوں کے ذاتی اسکولز اور ۲۰ ٪ سے زیادہ مدارس ہیں۔

(۲۸) سہ رخی پارلیمنٹ کے باشندوں کی اکثریت کو رد کرتے ہوئے 1984 میں ''ہاؤس آف ڈیلیگیٹ'' کے انتخابات میں صرف 5 ٪ لوگوں نے ووٹ دیا، 1980 کی دہائی کے نصف میں مقامی ہندوستانی طلبۂ متحدہ جمہوری محاذ کی سرگرمیوں میں شامل ہوگئے۔

(۲۹) 1994 میں مسلمانوں کو پہلی بار ووٹ ڈالنے کی اجازت ملی اور وہ ملک کے مکمل باشندے ہوگئے، مسلمان اب تجارتی مقصد اور دین کی تبلیغ کے لیے گورے اور کالوں کی بستیوں میں داخل ہوسکتے تھے اور بمشکل ہی کوئی سرکاری تقریب کسی مسلمان کے افتتاح کے بغیر منعقد ہوتی ہو۔

(۳۰) 1994 کے بعد تجارتی اور مالیاتی دنیا میں ''البرکۃ بینک'' کا قیام عمل میں آیا، آج اس میں مسلمانوں کا 500 ملین رینڈ سے زیادہ پیسہ جمع ہے، مسلمانوں کا پہلا میچول فنڈ ''اوسس ایکوٹی فنڈ'' کے نام سے ۶ بلین رینڈ سے زیادہ مالیت کو کنٹرول کرتا ہے۔ 2001 میں جنوبی افریقہ میں ''نیشنل اوقاف فاؤنڈیشن'' کا قیام ہوا؛ تاکہ ملک میں اوقاف کے اداروں کے قیام کو پائیدار تر قیاتی اداروں کے طور پر فروغ دیا جائے اور اکتوبر 2003 میں جرمنی کی ایک بڑی کمپنی کے تعاون سے تکافل (انشورنس) کے طور پر کمپنی کا آغاز ہوا۔

(۳۱) ساؤتھ افریقہ میں مرحوم اسماعیل محمد کی پہلے چیف جسٹس کے طور پر تقرری مسلمانوں کی سیاست میں بڑی کامیابی تھی، دلاّ عمر بھی ایک قابل ذکر رکن پارلیمان تھے، جن کا 1994 کے بعد انتقال ہوگیا، اس وقت مسلمانوں کے سامنے یہ چیلنج ہے کہ وہ اپنے آپ کو کنارہ کش نہ کریں؛ بل کہ مکمل طور پر تمام سیاسی ڈھانچوں میں شریک ہوں اور اس تحریک کو برقرار رکھیں۔

(۳۲) تازہ ترین مردم شماری کے مطابق جنوبی افریقہ میں 2 ملین مسلمان ہیں جن میں مقامی افریقی مسلمانوں کی ایک بڑھتی ہوئی تعداد ہے، مسلمانوں کی آبادی دو فی صد سے کم ہے، بہرحال آج جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کے غیر سرکاری ادارے 1500 سے کم نہیں ہیں۔

(۳۳) جب ملک ایک قوم کے طور پر متحد ہوگیا تو مسلمان بھی ایک آواز ہوگئے، اس طرح 1997 میں ''علما کونسل'' کی تشکیل ہوئی، اس مجلس نے ''قومی مذہبی رہنما قوم'' سے اپنے آپ کو ملحق کرلیا، جو جنوبی افریقہ میں تمام مذاہب وعقائد کی ایک آواز ہے، اس وقت جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت ایک پلیٹ فارم پر متحد ہونا ہے اور ضرورتوں کو پوری کرنا ہے خواہ وہ ضرورتیں معاشی ہوں یا مذہبی، سماجی ہوں یا قانونی، یا فلاحی ہوں۔ (اردو ترجمہ مولانا شمس الہدی استاذ جامعہ انگریزی مضمون (Islamic History & Civilisation in South Africa by Maulana Khalid Dhorat)

احقر کا جنوبی افریقہ کا پہلا سفر شعبان کے تیسرے ہفتہ میں ہوا، جو تقریباً دس یوم پر مشتمل تھا اور اس سفر میں اکثر وبیش تر ملاقاتیں اور زیارتیں گجراتی مسلمانوں سے اور ان کے قائم کردہ اداروں کی ہوئی، اس لیے داستانِ سفر شروع کرنے سے پہلے گجراتی مسلمانوں کا تعارف کروا دینا مناسب ہوگا۔

گجراتی مسلمان:

گجرات کا اطلاق ہندوستان کی ایک ریاست پر بھی ہوتا ہے اور پاکستان میں بھی ایک شہر گجرات کے نام سے موجود ہے، اس وقت گجراتی مسلمان سے ہندوستان کے صوبۂ گجرات کے مسلمانوں کا تعارف مقصود ہے؛ مگر گجراتی مسلمان کے تذکرے سے پہلے ریاستِ گجرات کی تاریخ پر ایک نظر ڈالتے چلتے ہیں:

ریاستِ گجرات:

مؤرخین کی ایک بڑی جماعت کی تحقیق کے مطابق، مسلمانوں کے آنے سے پہلے اس پورے ملک ہندوستان کا کوئی نام نہ تھا[۱] ہر خطے کا الگ الگ نام تھا اور اس کی راجدھانی کے نام سے مشہور تھا، مسلمانوں کے آنے کے بعد ہندوستان ایک عظیم ملک ''ہندوستان'' کے نام سے دنیا کے نقشہ پر آیا، مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں تبت، برما، نیپال، پاکستان، بنگلادیش، سری لنکا؛ یہ تمام ممالک، موجودہ ہندوستان سمیت ہندوستان کا حصہ تھے۔

[۱] مقدمۂ تاریخ گجرات۔ ''وی کی پیڈیا'' کے مطابق ہندوستان صرف تین ادوار میں ایک ملک رہا ہے، ایک چندر گپت موریا کے دور میں، دوسرے مغلیہ دور میں اور تیسرے انگریز کے دور میں؛ سب سے بڑی سلطنت اورنگ زیبؒ کے دور میں رہی ہے، ان تین ادوار کے علاوہ ہندوستان ہمیشہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا رہا (اور ہندوستان کا ہر اعتبار سے سب سے سنہرا دور مسلمانوں کا دور رہا ہے۔)

ہندوستان کی وجہ تسمیہ:

ہندوستان کو (۱) ہند (۲) انڈیا (۳) بھارت (۴) ہندوستان کے نام سے کیوں یاد کیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں اہل عرب کا کہنا ہے کہ ہند اصل میں یا تو 'ہند' سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں " السیف الأحـــــدب " یا اس کے معنی ہیں "مـجـمـوعة مـن السيـوف " یعنی تلواروں کا مجموعہ، بعض نے سو تلواروں کو ہند کہا ہے، اہل عرب نے ہندوستانیوں کو ہندی اس لیے کہا کہ وہ تلواروں کی طرح دبلے پتلے اور متصلب ہوتے ہیں، یا اس لیے بھی کہ زمانۂ قدیم میں ہندوستان تلواروں کی سب سے بڑی منڈی شمار ہوتا تھا۔

(nadialarab.com/?pageid=3018)

اہل فارس کا کہنا ہے کہ ہندوستان مشتق ہے ''ہند'' اور ''استھان'' سے، جس کے معنی ہیں ہندیوں کی زمین، بعض کا کہنا ہے کہ یہ اصل میں ''سندھو استان'' تھا، سندھ کی طرف نسبت کرتے ہوئے، بعد میں ہندوستان ہو گیا۔ یونانیوں کا کہنا ہے کہ یونانی لوگ Indio کہتے تھے، یعنی ہندی افراد کی زمین۔

(www.thaqafaonline.com)

بعض کا کہنا ہے کہ HINDIN سے INDIA ہو گیا، اصلاً عربی لفظ ہے۔

ہندوستان کو بھارت بھی کہا جاتا ہے، ہندوستان کی تاریخ میں ایک بھرت نامی بادشاہ گزرا ہے، مہا بھارت نامی کتاب اسی کی طرف منسوب ہے،

جس نے متحد ہندوستان کے لیے سب سے پہلے کوشش کی تھی (؛مگر یہ ایک سنی سنائی بات ہے) اس لیے بھارت نام دیا گیا۔[۱]

ہندوستان کی ایک وجہ تسمیہ 'سندھ دریا' (دریائے سندھ کے کنارے پر آباد لوگ) بھی مانی جاتی ہے۔ India اس لیے کہ سندھ کو یونانی میں بھی اندو کہتے تھے۔
و اللہ أعلم بحقیقة الحال!

تاریخ ہند کے مشہور مصنف اسماعیل قاسم فرشتہ ہندوستان کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

آدم علیہ السلام اول البشر ہیں اور ان کے عہد کو کم و بیش سات ہزار سال گزرے ہیں، (ہندوؤں[۲] اور مادّہ پرستوں کی طرح نہیں جو لاکھوں کروڑوں سالوں پر انسانی تاریخ کو مشتمل مانتے ہیں، بلا کسی مستند اور معتبر دلیل کے دنیا کی مدتِ قیام کو لاکھوں برس سے زیادہ بتانا ہمارے نزدیک غلط ہے) اور ہماری تحقیق کے مطابق درست یہ ہے کہ ہندوستان بھی دنیا کے دوسرے خطوں کی طرح حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد سے آباد ہوا۔

(تاریخ فرشتہ: جلد ۱/ ۳۱)

---

[۱] مہا بھارت کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ''مہا'' کے معنی ''بزرگ'' یا ''بڑے'' کے ہیں اور بھارت جنگ یا لڑائی کو کہتے ہیں، کیوں کہ اس کتاب میں بڑی بڑی لڑائیوں کا ذکر ہے اس لیے اسے ''مہا بھارت'' کہتے ہیں؛ لیکن یہ معنی درست معلوم نہیں ہوتا، کیوں کہ ہندی زبان میں ''بھارت'' کا لفظ کبھی بھی ''جنگ'' کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ بظاہر اس کتاب کی صحیح وجہ تسمیہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ چوں کہ اس میں مہاراجہ بھرت کی اولاد کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے یہ ======

طوفان کے بعد حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے تینوں بیٹوں یعنی سام، یافث اور حام کو از روئے معاش کھیتی باڑی اور کاروبار کا حکم دے کر دنیا کے چاروں اطراف میں روانہ کیا۔ سام سے عرب کے تمام قبائل اور فارس ان کی نسل سے ہیں۔ یافث سے ترکی، مغل، ازبک اور چین کی نسلیں چلیں۔ حام سے ہند، سندھ، حبش، افرنج کی نسلیں چلیں۔ حام کے چھ بیٹوں میں سے ایک کا نام ہند تھا، اس کی طرف نسبت کرتے ہوئے ہندوستان کو ہند اور ہندوستان کہا جاتا ہے۔

(ایضاً: جلد۱/۳۱)

=== کتاب اسی کی طرف منسوب کی گئی ہے، کثرتِ استعمال کی وجہ سے ''بھرت'' میں ''الف'' کا اضافہ ہو کر لفظ بھارت بن گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب [تاریخ فرشتہ ص:۳۰]

[۲] ہندوؤں کی تاریخ اور عقیدہ کے مطابق ہندوستان چار ادوار سے گزرا ہے: (۱) ست یگ (۲) تریتا یگ (۳) دواپر یگ (۴) کل یگ۔ یہ یگ گردش کرتے رہتے ہیں، ست یگ سترہ لاکھ اٹھائیس ہزار (۱۷۲۸۰۰۰) سال پر مشتمل ہوتا ہے اور تریتا یگ بارہ لاکھ چھیانوے ہزار سال (۱۲۹۶۰۰۰) پر، دواپر یگ کی مدت آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار (۸۶۴۰۰۰۰) اور کل یگ چار لاکھ بتیس ہزار سال (۴۳۲۰۰۰۰) کا ہوتا ہے، ہم کل یگ سے گزر رہے ہیں۔ اس حساب کی کوئی دلیل نہیں ہے، تین دور ایک بار گزر چکے ہیں یعنی (۳۸۸۸۰۰۰) سال اور اس وقت چوتھا دور چل رہا ہے۔

آج کل کے مادی نظریہ کے اعتبار سے ظہورِ کائنات کو ۱۵/ سے لے کر ۲۰/ ارب سال ہوئے ہیں، زمین کی عمر ساڑھے چار ارب سال اور حیات کا ظہور ساڑھے تین ارب سال پہلے ہوا، ان فلاسفہ کے اعتبار سے (جو عظیم دھما کہ Big Bung کے قائل ہیں)۔ سب سے بڑے سائنسی ادارے NASA کا کہنا ہے کہ ۱۳۰۷/ ارب سال شمسی۔ بعض مسلمان مفکرین نے ان سائنسی نظریات کو قرآن سے جوڑنے کی کوشش کی ہے، جو سراسر غلط ہے، جب کہ بعض مادہ پرست اور بعض جدید فلاسفہ اور سائنس داں کائنات کو ازلی (یعنی ہمیشہ سے ہے) مانتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ بحث فضول ہے کہ کائنات کی عمر کتنی ہے، امام غزالیؒ اور بیرونیؒ نے کہا کہ ہم مسلمانوں کو اس بحث میں جانے کی ضرورت ہی نہیں اور میں کہتا ہوں کہ قیامت اور قبر میں اس کے متعلق سوال بھی نہیں ہوگا، لہٰذا خاموشی ضروری ہے۔ اگر یہ ضروری ہوتا تو قرآن وحدیث میں اس کا ذکر ہوتا، معلوم ہوا کہ یہ غیر ضروری ہے، بعض قدیم وجدید مفکرین نے اسلامی نقطۂ نظر سے ۷/ ہزار سال، بعض نے دس ہزار سال بیان کیے ہیں؛ مگر یہ ان کی اپنی رائے ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے نہیں، بظاہر انھوں نے اسرائیلی روایات کو بنیاد بنا کر یہ رائے قائم کی ہے، چوں کہ تحریف شدہ تورات وغیرہ میں سات ہزار سال اور بعض نسخوں میں دس ہزار سال مذکور ہے۔]

بہر حال زیادہ معتبر یا تو یہ آخر الذکر ہے یا دریائے سندھ کی طرف منسوب قول؛ ورنہ (فارسی میں) ہندوستان اور (انگلش میں) India یہ اقوال تو انگریز اور ہندوؤں کے وضع کردہ ہیں، جس کا مقصد ہندوستان کی نسبت کو مسلمانوں سے ختم کرنا اور ہندو قومیت کا احیاء ہے؛ جیسا کہ مستشرقین نے دنیا کے دیگر علاقوں کے سلسلہ میں کیا ہے، دنیا میں تاریخ کے ساتھ اگر کسی نے سب سے زیادہ تحریف سے کام لیا ہے تو وہ اہلِ مغرب ہی ہیں؛ جو قوم آسمان سے نازل شدہ کتابوں کی تحریف کر سکتی ہے، اس کے لیے تاریخِ عالم کو مسخ کرنا کوئی بعید از امکان نہیں۔ علمی خیانت اور مسخِ تاریخ میں انگریزوں اور اہلِ مغرب کا کوئی ہم سر نہیں ہو سکتا، اسلام کے مضبوط علمی اور استدلالی نظام کا کوئی توڑ اہلِ مغرب کے پاس نہیں تھا، سوائے تاریخ کو مسخ کرنے اور عقلیت کے نام پر مفاد پرستی، شہوت رانی کو سائنس اور فلسفہ کا نام دے کر اسلامی نظام کا کلی استیصال یعنی خاتمہ؛ جو قوم روایت سے کٹ چکی ہو، تاریخ و روایت کے ہوتے ہوئے تجربیات کے نظریے استعمال کرتی ہو اور آثارِ قدیمہ، حفرات کی کھدائی اور پھر اسی پر بے جا اندازے لگاتی ہو، اس کی حماقت کا کیا کہنا؛ جو وحی کے مقابلہ میں مشاہدہ وتجربہ کو فوقیت دے، کیا ایسوں کو کبھی عقل مند اور ہوش مند کہا جا سکتا ہے؟؟؟!!! [۱]

[۱] آج کل علم ودانش کی دنیا میں تحقیق کے علمی طریقے (scientific method) کا بڑا چرچا ہے، جسے سائنسی طریقہ بھی کہا جاتا ہے، جدید دور کا تعلیم یافتہ انسان ہر مسئلے کا جواب اسی طریقے سے حاصل کرنے کا خواہش مند ہے، ہر سوال کے جواب کو وہ اسی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا ہے، چنانچہ تاریخ کو بھی آج ''تحقیق کے علمی طریقے'' کے مراحل سے گزارا جا رہا ہے، صرف یورپ یا امریکہ نہیں، اسلامی تاریخ بھی اس تجربے سے محفوظ نہیں۔ اس طرح جو تحقیقات سامنے آ رہی ہیں، انہیں پڑھ کر دورِ حاضر کا نوجوان یہ کہنے لگا ہے کہ اسلاف کا طریقہ ''علمی'' نہیں ''تقلیدی'' تھا، وہ اندھے کنوئیں کے =====

....

....

==== مینڈک تھے، ایک مخصوص سطح سے اوپر نہیں سوچ سکتے تھے!! آزاد تحقیق تو یہ ہے کہ مستشرقین اور آج کے جذبات پسند حضرات پیش کر رہے ہیں، زیرِ نظر گفتگو اسی لیے کی جا رہی ہے تا کہ ایسے نوجوانوں کو اپنے خیالات پر نظرِ ثانی کا موقع ملے، انہیں معلوم ہو کہ اسلاف کا طریقۂ تحقیق کیا تھا اور آج کل کے علمی طریقے سے کیوں کر بہتر اور مؤثر تھا، اس موضوع پر اپنی معروضات پیش کرنے کی پیش کش کرنے سے قبل قارئین کو ''تحقیق کے علمی طریقے'' کی تعریف یاد دلاتا ہوں، دورِ جدید کے اہلِ دانش اس کی تعریف یوں کرتے ہیں: ''یہ وہ علمی طریقہ ہے جس کے ذریعہ کسی علم سے متعلقہ حقائق کا انکشاف کیا جاتا ہے اور عقل و تجربے کی بنیاد پر کسی نتیجے تک پہنچا جاتا ہے'' دوسرے لفظوں میں علمی بحث وہ ہوتی ہے، جس میں ایک خاص طرزِ استدلال اور طریقۂ استنتاج سے کام لیا جاتا ہے اور دلائل کو ایک ترتیب سے رکھ کر ان کا موازنہ کر کے نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔

یاد رہے کہ علمی بحث کی دو قسمیں ہیں: ایک استدلالی، دوسری تجرباتی! استدلالی میں کسی خبر، واقعے یا منقولہ بات کو پیش کیا جاتا ہے، چاہے وہ تحریری ہو یا زبانی، اس طرح جمع کردہ مواد کو دیگر قرائن کی روشنی میں دیکھا بھالا جاتا ہے اور موازنہ کر کے فیصلہ کیا جاتا ہے، استدلال انسان اور معاشرے سے متعلقہ علوم میں کام آتا ہے، مثلاً قانون، ادب، لغت، تاریخ، عمرانیات وغیرہ۔ تجربے سے مراد یہ ہے کہ ایک نظریے کو درست یا غلط ثابت کرنے کے لیے حسی چیزوں کو تجربہ گاہ میں مختلف مراحل سے گزارا جائے تا کہ حقیقت واضح ہو جائے، تجربہ عموماً طبعی علوم مثلاً طب، کیمیا، فزکس وغیرہ میں کام آتا ہے۔ اہلِ مغرب کے ہاں اب تک روایت اور اسناد کی صحت کا کوئی ضابطہ مروج نہیں ہے، اس وقت تاریخی واقعات کی چھان بین اور تجزیے کا جو طریقہ مغربی تحقیق گاہوں میں رائج ہے، اس میں محقق روایات، آثار، خبروں اور رپورٹوں کے انبار جمع کر کے عقلی طور پر ان کا تجزیہ اس طرح کرتا ہے جس سے اس کی منشا اور مطلب کی بات کسی طرح ثابت ہو جائے، اس بحث میں روایات پر نقد و جرح یا ان کے درمیان ترجیح کے کسی ٹھوس ضابطے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، بل کہ کوئی ٹھوس ضابطہ ہے ہی نہیں، محقق اپنی عقل، منطق اور چرب لسانی سے کام لے کر جس طرح چاہے جرح کر سکتا ہے، مسلمانوں کے برعکس ان کے ہاں اسناد، جرح و تعدیل، اصولِ روایت، رجال اور طبقات کا کوئی وجود نہیں، بل کہ اپنی فکرِ خام، تخیلات بل کہ وساوس و توہمات پر مکمل بھروسہ کیا جاتا ہے، جیسا کہ ان کے اکثر مفکرین کسی بھی مسئلے پر بات کرتے ہوئے یورپ اور امریکا کو دنیا کا مرکز تصور کرتے ہیں، اسی طرح بیش تر محققین ان قیاسات پر ایمان رکھتے ہیں کہ انسان لاکھوں سال قبل وجود میں آیا، وہ پہلے جانوروں کی طرح برہنہ پھرتا تھا، جنگلوں اور غاروں میں زندگی گزارتا تھا، رفتہ رفتہ اس نے زبان کا استعمال سیکھا، ستر ڈھانپنا اور متمدن بننا سیکھا==========================

....

....

=======معاشرتی علوم:

چوں کہ ہمارا موضوع، تاریخ کے حوالے سے ہے اور تاریخ معاشرتی علوم کا حصہ ہے، اس لیے معاشرتی علوم کے پہلو پر ہم ذرا کھل کر بات کریں گے، معاشرتی علوم میں مسلم علما شرعی علوم کے دائرے میں رہتے ہوئے عقل، مشاہدے، معاشرے کے تجزیے، روایات اور خبروں سے کام لیتے ہیں، اس بارے میں انہوں نے صدیوں پہلے سے ایسے معیاری ضابطے مقرر کر دیے ہیں جن کی مثال مغربی تحقیقی اداروں میں آج بھی نہیں مل سکتی۔ مشاہدے اور معاشرتی تجزیے میں بھی آخری سرا ''خبر'' ہی بنتا ہے، اس لیے علمائے امت نے خبر کی چھان بین کے لیے معیاری اصول وضوابط طے کر دیے، کیوں کہ اسی خبر سے تجزیے مرتب ہوتے ہیں اور اسی سے تاریخ!!!

آیئے دیکھتے ہیں کہ مسلم علما نے خبروں کی چھان بین کے لیے کیا کیا اصول مقرر کیے ہیں:

(۱) خبر دینے والے کا کتاب و سنت کے مطابق توحید، رسالت، وحی، تقدیر اور آخرت پر ایمان رکھنا، خبر وصول کرنے والے کا افواہوں اور وہمی و خیالی چیزوں پر یقین نہ کرنا۔

(۲) کسی روایت، کسی دلیل یا کسی دستاویز کو پیش کرنے سے قبل اس کی صحت کا اطمینان کر لینا۔

(۳) دلائل پیش کرنے میں پوری امانت اور دیانت داری سے کام لینا۔

(۴) کوئی بھی مواد پیش کرتے ہوئے اس کا درست حوالہ دینا، یہ واضح کر دینا کہ یہ مواد کس راوی یا کون سی کتاب سے لیا گیا ہے، اس بارے میں کسی خیانت کا ارتکاب نہ کرنا۔

(۵) دلائل پیش کرنے میں پوری امانت اور دیانت داری سے کام لینا۔

(۶) فن کے ماہر علما کے اقوال بطور شواہد پیش کرنا۔

(۸) زبان و بیان کے صحیح اور واضح مفہوم کو اختیار کرنا اور اس کے لیے لغت کے مستند مآخذ اور قواعد پر اعتماد کرنا،

(۹) اسلاف اور علوم کے ائمہ کے بارے میں ان کی واضح تعلیمات سے متصادم روایات کو تسلیم نہ کرنا، ایسی باتوں کو ان پر جھوٹی تہمت مانا جائے گا۔

(۱۰) کلام اللہ، حدیث شریف، اور انبیا علیہم السلام کا ادب ملحوظ رکھنا۔

(۱۱) صحابۂ کرام اور اسلاف کا ذکر ادب و احترام سے کرنا، ان پر طعن و تشنیع سے احتراز کرنا۔

ان اصولوں کی تفصیل ملاحظہ کرنے کے لیے علامہ ''حافظ ابن عبدالبر مالکیؒ'' کی ''جامع بیان العلم وفضلہ'' ۴۶۷ تا ۴۷۰، خطیب بغدادیؒ کی ''الکفایة في علوم الروایة'' ص ۱۸۰، ۱۸۱، ۲۴۱، قاضی عیاضؒ کی ''الإلماع إلی معرفة أصول الروایة وتقیید السماع'' ص ۱۳۵ تا ۱۸۸، اور علامہ عراقیؒ کی ''التقیید والإیضاح شرح مقدمہ ابن الصلاح'' ص ۲۰۰ تا ۲۱۸ کا مطالعہ کیا جائے۔

(تلخیص از مقالہ اسلاف کا طرزِ تحقیق، از اسماعیل ریحان)

46

ہندوستان کی خصوصیات

"سبحة المرجان في آثار هندوستان"، میں بلگرامی صاحب مرحوم نے تو ثابت کیا ہے کہ "مستدرک" کی صحیح روایت اور امام سیوطیؒ کی ابن ابی حاتم کے حوالے سے نقل کردہ" الدر المنثور " کے مطابق، آدم علیہ السلام کا نزول ہندوستان کی سرزمین پر ہوا، صرف اسی پر بس نہیں کیا؛ بل کہ آپ پر پہلی وحی، آپ کا حج، آپ کی توبہ کی قبولیت، آپ کا قیام وغیرہ بے شمار فضائل سے سرزمینِ ہند مشرف ہوئی ہے، جسے خلاصہ کے طور پر یوں کہا جا سکتا ہے:

ہندوستان سب سے پہلا دارالبشر
ہندوستان سب سے پہلا دارالنبوة
ہندوستان سب سے پہلا دارالوحي
ہندوستان سب سے پہلا دارالهجرة
ہندوستان سب سے پہلا دارالإسلام
ہندوستان سب سے پہلا دارالخليفة
ہندوستان سب سے پہلا دارالتوبة
ہندوستان سب سے پہلا دارميثاق البشر
ہندوستان سب سے پہلا دارالبشارة

ہندوستان سب سے پہلا داراجتماع الأنبياء
ہندوستان سب سے پہلا دارالشريعة
ہندوستان سب سے پہلا دارالنجاة
ہندوستان سب سے پہلا دارالطيب
ہندوستان سب سے پہلا دار الذهب والفضة
ہندوستان سب سے پہلا دارالحبوب والطعام
ہندوستان سب سے پہلا دارالجواهر
ہندوستان سب سے پہلا دارالفواكه
ہندوستان سب سے پہلا دارالأذان [۱]

---

[۱]﴿سبحة المرجان في آثار هندوستان﴾
وأخرج ابن أبي حاتم عن عليٍ رضي اللّٰه عنه قال : " خير واديين في الناس وادي مكة ووادي إرم بأرض الهند ،(الدر المنثور في التفسير المأثور :۱۳/۶ ، سورة الأحقاف ، دار الكتب العلمية بيروت)
وأخرج ابن أبي حاتم وابن عساكر عن الحسن قال : أهبط آدم بالهند .
(الدر المنثور : ۱۱۲/۱ ، سورة البقرة :الآية/۳۶
وأخرج ابن سعد وابن عساكر عن ابن عباس قال : أهبط آدم بالهند .(أيضًا : ۱۱۱/۱ ، البقرة ، الآية/۳۶)
وأخرج عبد الرزاق،وابن جرير، وابن المنذر، وابن أبي حاتم من طريق معمر ، عن قتادة قال : وضع اللّٰه البيت مع آدم، حين أهبط اللّٰه آدم إلى الأرض ، وكان مهبطه بأرض الهند ، . (أيضًا :۶۳۵/۴، ۶۳۶، سورة الحج ، الآية/۲۶)
وأخرج ابن جرير، وابن أبي حاتم ،والحاكم، وصححه عن ابن عباس : إن أول ما أهبط اللّٰه آدم إلى أرض الهند . وفي لفظ : بدجناء أرض الهند . (أيضًا : ۱۱۱/۱ ، سورة البقرة ، الآية/۳۶)
وأخرج الديلمي في مسند الفردوس بسندٍ واهٍ، عن علي قال : " سألت النبي ﷺ عن قول اللّٰه ﴿فتلقّى اٰدم من ربه كلمات فتاب عليه﴾ فقال : إن اللّٰه أهبط آدم بالهند ،...... ومكث آدم بالهند مائة سنة باكيًا على خطيئته==========

....

....

=======، حتى بعث اللّٰه إليه جبريل وقال : يا آدم ! ألم أخلقک بيدي ؟ ألم أنفخ فيک من روحي ؟ ألم أسجد لک ملائکتي ؟ ألم أزوّجک حواء أمتي ؟ قال : بلى . قال : فما هذا البكاء ؟ قال : وما يمنعني من البكاء وقد أخرجت من جوار الرحمن ! قال : فعليک بهؤلاء الكلمات . فإن اللّٰه قابل توبتک ، وغافر ذنبک . قل : اللهم إني أسألک بحق محمد وآل محمد ، سبحانک لا إلٰه إلا أنت عملت سوءاً وظلمت نفسي فاغفرلي، إنک أنت الغفور الرحيم . اللهم إني أسألک بحق محمد وآل محمد، سبحانک لا إله إلا أنت عملت سوءاً وظلمت نفسي، فتب عليّ، إنک أنت التوّاب الرحيم . فهؤلاء الكلمات التي تلقى آدم" .(أيضًا : ۱/۱۱۹، البقرة ، الآية/۳۷)

وأخرج البيهقي عن عطاء قال : أهبط آدم بالهند ، فقال : يا رب ! ما لي لا أسمع صوت الملائكة كما كنت أسمعها في الجنة ، فقال له : لخطيئتک يا آدم، فانطلق فابن لي بيتا فتطوف به كما رأيتهم يتطوفون ، فانطلق حتى أتى مكة فبنى البيت ، فكان موضع قدمي آدم قرى وأنهارا وعمارة ،وما بين خطاه مفاوز، فحج آدم البيت من الهند أربعين سنة . (أيضًا : ۱/۶۸۰ ، دار هجر مصر)

وأخرج ابن جرير والحاكم وصححه والبيهقي في البعث وابن عساكر عن ابن عباس قال : قال علي بن أبي طالب : أطيب ريح الأرض الهند ، أهبط بها آدم فعلق ريحها من شجر الجنة . (أيضًا : ۱/۱۱۱ ، البقرة ، الآية/۳۶)

وأخرج الطبراني، وأبو نعيم في الحلية، وابن عساكر عن أبي هريرة، قال : " قال رسول اللّٰه ﷺ : نزل آدم عليه السلام بالهند فاستوحش ، فنزل جبريل فنادى بالأذان : اللّٰه أكبر ، أشهد أن لا إله إلا اللّٰه مرتين ، أشهد أن محمدا رسول اللّٰه مرتين . فقال : ومن محمد هذا ؟ قال : هذا آخر ولدک من الأنبياء " . (أيضًا : ۱/۱۱۱ ، البقرة ، الآية/۱۱۱)

وأخرج سعيد بن منصور عن عطاء بن أبي رباح، قال : هبط آدم بأرض الهند ومعه أعواد أربعة من أعواد الجنة ، وهي هذه التي تتطيب بها الناس ، وأنه حج هذا البيت على بقرة . (أيضًا : ۱/۱۱۲ ، البقرة ، الآية/۳۶)

قال القرطبي : عن سعيد بن جبير قال : " خلق اللّٰه آدم من أرض يقال لها دجناء " . (تفسير اللباب : ۱/۱۹۸۳ .ط، دار الكتب العلمية ، بيروت ، أبو حفص عمر بن علي بن عادل الدمشقي الحنبلي ، المتوفى بعد سنة ۸۸۰ هـ)

[عام طور پر مفسرین میں سے امام ابن کثیر، طبری، سیوطی، وغیرہ نے اور محدثین میں حاکم، طبری، بیہقی، ابن ابی حاتم اور مؤرخین میں امام عساکر وغیرہ نے نزول آدم کی نسبت سرزمین ہند کی طرف کی ہے اور بعض حضرات نے اسے اشہر الروایات کہا ہے، جس سے کسی نہ کسی درجہ آدم علیہ السلام کے سرزمین ہند پر نزول کا پتہ چلتا ہے، نزول آدم کی روایت کو عام طور پر محدثین نے ضعیف تو کہا ہے؛ مگر موضوع نہیں کہا بل کہ بعض محدثین نے اسے صحیح کہا ہے۔ واللہ اعلم]

48

بہرحال برکات آدم علیہ السلام کا سب سے پہلا مرکز ہندوستان، اور روحانی و مادی نعمتوں کے نزول کا مہبط ہے، اس کے بعد حضرت نوح اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے واقعات میں بھی ہندوستان کا تذکرہ ملتا ہے۔

''الغرض'' ہندوستان اپنے اندر بہت سی خوبیوں کا حامل ہے اور یہ بات مسلَّم ہے کہ ہندوستان کے اصل باشندے مسلمان ہی ہیں، جیسا کہ ''تاریخِ فرشتہ'' میں مرقوم ہے:

ہندوستان میں بت پرستی:

چوں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے پوتے ہند نے اپنے بزرگوں کو خدا کی عبادت اور اطاعت گزاری کرتے ہوئے سنا اور دیکھا تھا، لہٰذا وہ خود بھی اسی راہ پر گامزن رہا اور اس کی اولاد بھی کئی نسلوں تک اسی مشرب کی پیروی کرتی رہی۔ مہاراج کے زمانے میں ایران سے ایک شخص ہندوستان آیا اور اس نے یہاں کے لوگوں کو آفتاب پرستی کی تعلیم دی، اس کی تعلیم کو بہت فروغ حاصل ہوا؛ یہاں تک کہ ستارہ پرست لوگ بھی آگ کی پرستش کرنے لگے؛ لیکن اس کے بعد جب بت پرستی کا رواج ہوا، تو یہی طریقہ سب سے زیادہ مروج ومقبول ہوا۔ بت پرستی کی اس درجہ مقبولیت اس سبب سے ہوئی کہ اس برہمن نے جس کا تذکرہ اوپر کیا جاچکا ہے، راجہ کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ جو شخص اپنے بزرگوں کی سونے چاندی یا پتھر کی شبیہ بنا کر اس کی پرستش کرتا ہے، وہ سیدھے راستے پر ہوتا ہے، اس عقیدے کو لوگوں نے اس حد تک اپنایا کہ ہر چھوٹا بڑا اپنے بزرگوں کے بت بنا کر ان کی پوجا کرنے لگا، خود راجہ سورج نے بھی دریائے گنگا کے کنارے شہر قنوج آباد کر کے وہاں بت پرستی شروع کی۔

(تاریخ فرشتہ: جلد ۱/ ۳۵)

عام طور پر مغربی اور ہندو مؤرخین، کتبِ تاریخِ ہند میں جو یہ ذکر کرتے ہیں کہ ہندوستان کے اصل باشندے ’دراوڑ‘ ہیں اور پھر مشرق وسطیٰ سے ’آریہ‘ قبل المسیح چند صدیاں قبل آئے[۱]؛ نہ اس پر کوئی روایتی دلیل ہے، نہ کوئی اور ثبوت، محض اٹکل سے کام لیا گیا ہے؛ کیوں کہ تاریخ کوئی ایسی چیز نہیں جس کو تجربہ سے یا عقلی گھوڑے دوڑ اکر معلوم کیا جائے، صحیح تاریخ تو روایت پر ہی مبنی ہوتی ہے، کیوں کہ تاریخ نام ہے ماضی کے واقعات کے جاننے کا، تو ظاہر سی بات ہے اسے روایت کے بغیر کیسے جانا جا سکتا ہے؟ آثار اور حفریات یہ سب گھورکھ دھندے ہیں، مغربی اور غیر اسلامی مؤرخین کے پاس صحیح تو کیا کوئی غیر صحیح مصدر اور مرجع بھی نہیں ہے، تو وہ آثار قدیمہ وغیرہ پر تجربات کر کے متعین کرتے ہیں کہ یہ برتن، یہ قدیم مکان اتنے ہزار سال قبل کا معلوم ہوتا ہے، جہاں کتب تاریخ میں نزولِ حضرت آدم علیہ السلام اور دیگر قدیم تاریخی واقعات کا ذکر ہے؛ وہیں اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ ہندوستان کے مختلف خطوں میں بھی حضراتِ انبیا علیہم السلام کی بعثت عمل میں آئی ہوگی، بل کہ ناکارہ اپنے طالب علمانہ دور میں آج سے تقریباً بیس سال قبل والد ماجد (**دامت برکاتهم، أطال الله بقاء هم علينا بالعافية و الصحة والسلامة، ونفع به الأمة الإسلامية نفعا جما، وحفظه من شر الحاسدين وكيد الماكرين، وشماتة الأعداء وسيئ الأسقام والأمراض**) کی رفاقت میں سرہند گیا تھا،

---

[۱] یہ انگریز خائن کی سازش ہے، ؛مگر افسوس! ہمارے علما اور پچھلی صدی کے مؤرخوں اور لکھاڑوں پر بھی ہے کہ وہ بھی بغیر کسی ردوقدح کے ہندوستان کی تاریخ اپنی کتابوں میں اسی طرح ذکر کر رہے ہیں جو سراسر غلط ہے]

49

اسی موقع پر سرہند سے قریب ’’براز‘‘ نامی ایک دیہات میں ۲ نبیوں کی قبر پر جانا ہوا تھا، جن کے نام ابراہیم اور خضر بتلائے جاتے ہیں، دونوں کے بارے میں باپ بیٹے کا رشتہ بھی بتلایا جاتا ہے اور وہاں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ آج بھی کبھی کبھی بارش کے موسم میں جب قبریں برآمد ہوتی ہیں تو بعضے مرتبہ لمبی لمبی مردوں کی ہڈیاں بھی دیکھنے میں آتی ہیں، جو ہوتی تو انسان کی ہیں؛ مگر قد وقامت کے اعتبار سے موجودہ انسان کے بنسبت کافی طویل ہوتی ہیں، جس سے اس علاقہ میں قدیم بستیوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور ویسے بھی مؤرخین کے بیان کے مطابق ہندوستان کی ابتدائی انسانی آبادیاں سندھ، پنجاب اور راجستھان وگجرات میں ہونے کے امکانات زیادہ نظر آتے ہیں، اس سے بھی تائید حاصل ہوتی ہے۔[۱]

بہر حال ’’ہندوستان‘‘ مسلمانوں کی جدی وراثت ہے اور ہندوؤں کا یہ نعرہ: ’’ہندو، ہندی، ہندوستان، مسلم بھاگو پاکستان‘‘ جو ہندو انتہا پسند جماعت لگا رہی ہے؛ وہ سراسر بے بنیاد اور غلط ہے۔ ملکِ ہندوستان کی بنیاد بھی مسلمانوں نے رکھی، یہاں کے اولین باشندے بھی مسلمان ہی تھے[۲]، اس کا نام بھی مسلمانوں نے رکھا،

---

[۱] دورِ حاضر کی ایک سائنٹفک کھوج کے مطابق، تمام دنیا کے انسانوں کے رشتے سرزمینِ عرب سے ملتے ہیں؛ بل کہ ایک کھوج کے مطابق تو تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، جو اسلامی اعتبار سے بالکل بے غبار ہے۔

[۲] اگر حضرت آدم علیہ السلام والی روایت ضعیف ہو تب بھی حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی مسلمان اولاد کی آمد یہاں تاریخ سے ثابت ہے۔

اس کو متحد بھی مسلمانوں نے کیا، اس کو ترقی کے بام عروج پر بھی مسلمانوں نے پہنچایا اور وطن عزیز کو دشمن انگریزوں سے آزاد کرنے میں بھی سب سے زیادہ قربانی مسلمانوں نے دی، بل کہ مسلمان سو سال تک تنِ تنہا اس کی آزادی کی جدوجہد کرتا رہا ہے، ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک، اس کے بعد ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کی تحریک آزادی و جنگ آزادی میں اہم کردار مسلمان ہی نے ادا کیا ہے اور آزادی کے بعد بھی مسلمان نے اس کے ساتھ وفاداری کا سلوک کیا ہے۔ ملک کے قانون بنانے میں، ملک کی تعلیمی ترقی میں اور ملک کی اقتصادی ترقی میں؛ یہاں تک کہ ملک کی سائنسی ترقی میں بھی مسلمان پیش پیش ہیں۔ یہاں بت پرستی باہر سے آئی ہے، دہریت باہر سے آئی ہے، کرپشن باہر سے آیا ہے، ملک کے خزانے کو ترقی کے لیے استعمال کرنے کے بجائے اپنی جیبوں کو بھرنے کا کام آزادی کے بعد یہاں کے وزرا نے کیا ہے اور کر رہے ہیں، کیا یہ وزرا مسلمان ہیں؟!۔ ایک اندازے کے مطابق کم از کم ۵۵ر لاکھ کروڑ روپے 'کالا دھن' منتریوں اور بڑے سرمایہ داروں کے ملک سے باہر ہیں؛ لہٰذا ہم مسلمان اس ملک کے باشندے تھے، ہیں اور رہیں گے؛ ہمارے بغیر یہ ملک کبھی ترقی نہیں کر سکے گا، حقیقت حقیقت ہوتی ہے، وہ اپنے آپ کو منوا کر چھوڑتی ہے، چاہے کوئی انکار کرنے والا کتنا ہی انکار کیوں نہ کرے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مسلمان ہندوستان کا ''اٹوٹ حصہ'' ہے اور رہے گا ان شاء اللہ۔

قارئین! معذرت کے ساتھ میں اپنے اصل عنوان کی طرف یعنی گجرات کی تاریخ کی طرف قلم کا رخ موڑتا ہوں۔

گجرات کی وجہ تسمیہ:

دراصل بات چل رہی تھی جنوبی افریقہ کے سفر کے دوران گجراتی مسلمانوں سے واقف ہونے کی، اسی کے ذیل میں گجرات کی تاریخ کا تذکرہ چھڑ گیا اور چوں کہ گجرات اس وقت ہندوستان کا حصہ ہے؛ لہٰذا ہندوستان کا ذکر چھڑ گیا، گجراتی مسلمان، گجرات، ہندوستان سب ایک ہی لڑی کے موتی ہیں، لہٰذا طویل موضوع سے تعرض یہاں مناسب نہیں؛ البتہ اس کے کچھ ضروری گوشوں پر روشنی ڈال دی، جو حالات کے پیش نظر ضروری تھی، کیوں کہ پچھلے چند ہفتوں سے یہ بات اخبارات میں گردش کر رہی ہے کہ نصابی کتابوں میں بڑے پیمانے پر ردو بدل کیا جا رہا ہے، اور حکومت کی نگرانی میں محکمۂ تعلیم تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کا پروگرام بنا رہا ہے[۱]، ہم مسلمانوں کے لیے ایسے حالات میں چوکنا رہنا نہایت ضروری ہے۔ ہم جمہوری ملک میں رہتے ہیں، ہمیں ہمارے عقیدے اور تاریخ کو تحفظ بخشنے کا حق حاصل ہے، اس کا استعمال کرتے ہوئے اپنے عقیدے و فکر اور تاریخ کے دفاع کے لیے حکمت عملی تیار کرنی ہوگی اور نصابی کتابوں پر نظر ڈالنی ہوگی؛ تاکہ ہمارے نونہالوں کو گمراہ نہ کر دیا جائے، کیوں کہ مغرب نے اپنے غلبہ کے بعد، سب سے زیادہ گمراہی فلسفہ و سائنس، تاریخ اور ادیان کے تقابلی مطالعہ کی درایتی تفسیر سے عام کی ہے

---

[۱] [تاریخ کو بھگوا رنگ دینے کی کوشش جا رہی ہے اور غداروں کو ہیرو بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔]

اور کمالِ عیاری سے سیکولر تعلیم کے نام پر جو نصاب تیار کیا جاتا ہے اس میں سائنس کی دوشاخوں 'طبعیات' 'نفسیات' اور کامٹے [ا] کے مدوّن کردہ اصول تاریخ ہی پر پورا زور صرف کیا جاتا ہے، تاکہ مادیت کو فروغ حاصل ہو، اور انسان مذہب سے دور ہی نہیں ؛ بل کہ کٹ جائے ، جیسا کہ یا سر محمد خان کے مضمون سے پتہ چلتا ہے ، جس میں ایک یہودی صحافی کا کہنا ہے کہ: ''تمہاری جوانی اور بچپن اے مسلمانو! ہمارے قبضے میں ہے''۔

ناکارہ نے ہندوستان کے اسکولی نصاب کا بالاستیعاب اسلامی ، مذہبی اور علمی نقطۂ نظر سے تنقیدی مطالعہ شروع کر دیا ہے اور ''ہندوستان کے اردو نصاب'' کی پہلی سے لے کر تیسری تک مطالعہ کر کے مخدوش مقامات کو نشان زد کر دیا ہے ،

[ا] اگسٹ کامٹے (August Comte) جو انیسویں صدی کے نصف اول کا فرانسیسی مفکر ہے، اس کے نزدیک انسان کے فکری ارتقا کی تاریخ تین مرحلوں میں تقسیم ہے: پہلا مرحلہ الٰہیاتی مرحلہ (Theological Stage) ہے جب کہ واقعات کی توجیہ خدائی طاقتوں کے حوالے سے کی جاتی ہے ،دوسرا مرحلہ مابعد الطبیعیاتی مرحلہ (Meraphysical Stage) ہے، جس میں متعین خدا کا نام تو باقی نہیں رہتا، پھر بھی واقعات کی توجیہ کے لیے خارجی عناصر کا حوالہ دیا جاتا ہے، تیسرا مرحلہ ثبوتی مرحلہ (Positive Stage) ہے جب کہ واقعات کی توجیہہ ایسے اسباب کے حوالے سے کی جاتی ہے، جو مطالعہ اور مشاہدہ کے عام قوانین کے تحت معلوم ہوتے ہیں، بغیر اس کے کہ کسی روح ، خدا، یا مطلق طاقتوں کا نام لیا گیا ہو، اس فکر کی رو سے اس وقت ہم اسی تیسرے فکری دور سے گزر رہے ہیں، اور اس فکر نے فلسفہ میں جو نام اختیار کیا ہے وہ منطقی ثبوت (Logical Positivism) ہے۔ جو دنیا کے تمام مذاہب کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

[مذہب اور جدید چیلنج: ص۱۰]

واقعتاً مسلمانِ ہند ہی نہیں ، پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے سوچنے کا مقام ہے کہ اسکول میں جو نصاب پڑھایا جا رہا ہے، وہ کتنوں کو ایمان سے محروم کر چکا ہے یا ایمان وعقائد میں ان گنت دراڑ ڈال کر اسے کمزور کر چکا ہے اور ابھی بھی بہت سوں کو ارتداد کے دروازے پر لے کر کھڑا ہے ؛مگر افسوس! ہمارے علمائے مفکرین ،دانش ور، عمائدین سب خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، خدارا بیدار ہو جائیں اور غیرت ابی بکری کا مظاہرہ کیجیے '' **أینقص الدين وأنا حيّ** '' کیا میرے جیتے جی دین میں کوئی کمی کی جاسکتی ہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا!!! مولانا علی میاں ندوی نور اللہ مرقدہ نے صحیح ارشاد فرمایا'' **ردة ولا أبابكر لها** '' کہ ارتداد ایک بار پھر سر چڑھ کر بول رہا ہے ؛مگر اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی ابو بکر نہیں ، اللہ ہمیں اپنے اور اپنی آیندہ نسلوں کے ایمان کی حفاظت کی فکر عطا فرمائے اور ہمارا خاتمہ ایمان پر فرمائے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی اس نصیحت کو اپنے دل میں بسا لیجیے ﴿**ماتعبدون من بعدی**﴾ اور ہمارے بچے کہیں کہ ﴿**نعبد إلٰهک وإلٰه اٰبائک إبراهيم**﴾ کی ہمیں جیتی جاگتی تصویر بنا دے۔

گجراتی لفظ: گجرات اور گجراتی کس زبان کا اصل ہے اس سلسلہ میں کافی اختلاف ہے گجراتی زبان کے ایک ادیب مرشد کہتے ہیں کہ یا تو یہ سنسکرت لفظ ہے गुजर سے بنا ہے یا سراکت لفظ سے بنا ہے۔

(aksharnaad.com/2012/9njarati-language)

عام طور پر گجراتی تاریخ نویسوں اور ماہرین لغت نے گجرات کو گجر سے مشتق مانا ہے کہ ساتویں آٹھویں صدی عیسوی میں گجرات پر حکم رانی کی ہے۔

بہرحال بسیار جستجو کے بعد بھی بندے کو تاہنوز گجرات کی وجہ سے تسمیہ پر کوئی اطمینان بخش تحقیق نہیں مل سکی، اگر کسی قاری کے پاس ہو تو مطلع کریں، ورنہ بندہ آیندہ بھی اس کی تلاش میں رہے گا، ملنے پر قارئین کو مطلع کرنے کی کوشش کرے گا۔

''گجرات کا رقبہ مختلف ادوار میں بدلتا رہا، گجرات کا سب سے بڑا رقبہ مسلمان سلاطین کے دور میں رہا ہے، علامہ محمد بن طاہر پٹنیؒ کے تذکرہ سے معلوم ہوا کہ مغرب میں بحیرۂ عرب سے لے کر شمال میں پاکستان کے سندھ کا حصہ، مشرق میں موجودہ راجستھان، جنوب میں موجودہ مہاراشٹر کا بڑا حصہ بل کہ مدھیہ پردیش کا برہان پور سے آگے تک کا حصہ سب گجرات شمار ہوتا تھا۔''

''گجرات کی علاقائی سرحدیں، دوسرے کئی ملکوں کی طرح سیاسی اقتدار بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی ہیں۔ مختلف ادوار میں گجرات کی علاقائی سرحدوں کا جائزہ، ہمارے اس مقالے کے موضوع پر لکھنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے، قدیم تاریخی حوالوں میں جنوبی گجرات کو مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے، ابتدا میں اسے ناگاؤں کی سرزمین کہا جاتا تھا، بعد میں اسے ''انوپ دیش'' اور پھر ''سپارکا'' بھی کہا گیا ہے۔

بعد میں نویں صدی عیسوی کے آخر تک (بمبئی کے) جزیروں کے ہمراہ دریائے نربدا کے جنوب کا علاقہ ''اپرانتہ'' کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ دسویں صدی

عیسوی میں کھمبایت اور نربدا کے درمیان کے حصہ کا نام ''لاٹ'' رکھا گیا، بعد میں نربدا کے اضلاع بھی لاٹ میں شامل ہوگئے۔ تیرہویں صدی عیسوی کے آخر میں بمبئی اور شمالی کوکن کا شمار گجرات کے علاقے میں ہوتا تھا اور پندرہویں صدی کے آخر میں تو خاندیش کو بھی اس میں ضم کردیا گیا تھا۔

مغلیہ دور میں گجرات کو پچیس سرکاروں میں تقسیم کیا گیا تھا، جن میں بمبئی اور بسین کی سرکاریں بھی شامل تھیں، سلطان بہادر شاہ (۹۴۳-۹۳۲ھ/۱۵۳۶-۱۵۲۶ء) نے مہائم اور تھانہ دونوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا۔

مندرجۂ بالا سیاسی تبدیلیوں کے علاوہ بھی مسلمان مؤرخوں اور جغرافیہ نویسوں نے ہمیشہ تھانہ کو (جنوب میں) گجرات کا آخری شہر شمار کیا ہے۔ جنوبی ہند کا ذکر کرتے ہوئے ابن السعید المغربی لکھتا ہے: ''تھانہ گجرات کا آخری شہر ہے، (اس کا نام) تاجروں کی زبان کی نوک پر ہے، گو اس میں اکثریت ہندوؤں کی ہے البتہ یہاں مسلمان بھی رہتے ہیں۔''

المسعودی کا قول ہے: ''تھانہ لاراوی سمندر کے کنارے ایک مقام ہے''، ابو الفدا کہتا ہے: ''(تھانہ) لاران کے سمندر کے کنارے الہندو کے شہروں میں سے ایک شہر ہے'' جب کہ تھانہ کو گجرات کا سب سے زیادہ جنوب میں واقع شہر شمار کیا جاتا تھا۔

قدیم زمانے میں عرب لوگ ہسپانوی لوگوں سے بڑے جہازراں اور ڈچ لوگوں سے زیادہ بڑے تاجر تھے ایشیا اور یورپ کے بیچ کی تجارت پر ان کا مکمل تسلط تھا۔

ان کے جہاز نہ صرف البحرالمتوسط meditteranean میں لگاتار سفر کرتے تھے، جسے اس وقت عربوں کی جھیل کہا جاتا تھا، بل کہ وہ بحرِ ہند میں آسانی سے آتے جاتے تھے۔ عربوں کی عالمی تجارتی سرگرمیوں کا یہاں بیان مقصود نہیں البتہ ہندوستان اور عربوں کے تجارتی تعلقات کی تاریخ سے بھی بڑھ کر امور کے ساتھ ہمارا واسطہ ہے، یہ تعلقات تو سلیمان علیہ السلام (King.Solomon) اور بلقیس (Queen Of Sheba) کے زمانے جتنے پرانے تھے۔

(اس وقت) ہند اور عدن کے درمیان کئی بندرگاہیں تھیں اور چاؤل، کلیان اور سوپارا میں بڑی تعداد میں عربوں کی نوآبادیاں موجود تھیں۔ عرب تاجر (جنوبی ہند کے) ''کورومنڈل'' کے کنارے ہوتے ہوئے چین کی طرف سفر کرتے تھے، جہاں قبل از اسلام عربوں کی یادگاریں ''کینٹون'' میں اب بھی پائی جاتی ہیں۔

Agatharkhid (زمانہ 180 B.C.) کہتا ہے کہ اس کے زمانے میں ہندوستان کی تجارت یمن کے سابعی لوگوں کے قبضہ میں تھی، اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ سابعی لوگ عدن سے ''نوآبادیاں اور فیکٹریاں'' ہندوستان میں بسانے کے لیے بھیجتے تھے۔ Warmington کا بیان ہے کہ یمن کے سابعی لوگوں نے ہندوستان کے ساتھ منافع بخش اور مضبوط تجارت قائم کر رکھی تھی اور یہ کہ وہ (اس تجارت کے ذریعہ) بہت دولت مند بھی بن گئے تھے۔

Ptolemy (زمانہ B.C.150) کے ہندوستان (Map of India) میں ایک لفظ آیا ہے: Melizigeris، اس لفظ کے آخری حصہ میں بھی عربی لفظ ''جزیرہ'' کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ اس وقت لفظ جزیرہ (بمبئی کے قریب بحیرۂ عرب میں واقع) ایک جزیرہ (Island) کے لیے استعمال ہو رہا ہے، جس کی شکلیں حسب ذیل ہیں: جنجیرہ یا جنزیرہ''۔

(عربی زبان وادب کی ترقی میں گجرات کے دانش وروں کا حصہ: ص۱۲ تا ۱۶)

گجرات کے علاقہ پر چوں کہ مسلمانوں نے طویل عرصہ حکومت کی ہے، ۱۲۹۷ تک یعنی تقریباً ۶۰۰ سال مسلمان گجرات پر حکم رانی کرتا رہا اور الحمدللہ! عدل وانصاف کے ساتھ بل کہ دین داری میں یہاں کے حکم راں ہندوستان میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔

سرزمین گجرات عہد قدیم ہی سے ہر اعتبار سے ترقی یافتہ رہی، روحانی، مادی، تجارتی، زرعی ہر اعتبار سے آج جو لوگ گجرات کی ترقی کا سہرا اپنے سر لینا چاہتے وہ یا تو تاریخ سے واقف نہیں یا تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہیں، کیوں کہ اس کا جائے وقوع بہت زیادہ موزوں ہے، یہاں ایک جانب دریا ہے تو دوسری جانب بڑی بڑی ندیاں ہیں، جو اسے دنیا کے دوسرے خطوں سے زمانۂ قدیم سے جوڑتے چلے آرہے ہیں اور ندیوں کی وجہ سے زراعت کے لیے یہ زمین بہت مناسب ہے، قدیم تاریخ نویسوں کے مطابق گوجر، یونان اور دیگر بہت سی قوموں نے حکمرانی کی ہے۔

گجرات کے بارے میں جو کہا جارہا ہے کہ پچھلے پندرہ سال میں اس نے ترقی کی، سراسر بے بنیاد ہے، یہ خطہ تقریباً ۶۰۰/سال سے مسلسل ترقی کی راہ پر بلا کسی توقف کے گامزن ہے، اس کی ترقی میں حکم رانوں سے زیادہ یہاں کے باشندوں کے تجارتی ذوق کو دخل ہے، یہاں کے باشندوں کی فطرت میں تجارت ہے، یہ نوکری سے زیادہ تجارت کو پسند کرتے ہیں اور ساتھ ہی مذہب سے ان کا تعلق بھی مضبوط ہوتا ہے۔

گجرات میں مسلمان کیوں کم؟:

یہاں ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ جب گجرات میں مسلمانوں نے قریبی عہد میں تقریباً ۶۰۰/سال حکومت کی تو پھر یہاں مسلمان صرف ۱۰/فی صد کیوں ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب آزادی کے بعد ۱۹۶۰ میں مختلف ریاستیں بنائی گئیں اس موقع پر حکومت ہند نے بڑی چالاکی کا مظاہرہ کیا، جن خطوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی ان کو اس طور پر تقسیم کیا کہ مسلمان وہاں اکثریت میں نہ ہو سکے، مثلاً گجرات ہی کو لے لیا جائے، اس کے کچھ حصہ کو مہاراشٹر میں کچھ کو ایم پی میں اور کچھ کو گجرات میں رکھا، اگر ان خطوں کی تقسیم اس طرح باقی رکھی جاتی جس طرح آزادی سے پہلے تھی تو مسلمان کم از کم ۳۰ فی صد سے زائد صرف گجرات میں ہوتے، دکن کو بھی اسی طرح تقسیم کیا گیا، کچھ آندھرا میں، کچھ مسلمان علاقہ کو کرناٹک میں، کچھ مہاراشٹر میں شامل کردیا؛ تاکہ مسلمان کسی جگہ اکثریت یا بڑی تعداد میں نہ رہ سکے؛

اسی لیے آپ غور کرسکتے ہیں کہ آخر آزادی سے ۱۳ سال بعد ۱۹۶۰ میں کیوں ریاستیں بنائی گئیں، یہ سب سروے کرنے کے بعد ایک منظّم پلاننگ کے ذریعہ کیا گیا۔ بہرحال ”ومکروا ومکر اللّٰہ واللّٰہ خیر الماکرین“

میں دوٹوک الفاظ میں یہ بات کہوں گا کہ ہندوستان کو ترقی کے بام عروج پر مسلمانوں نے پہنچایا ہی اور صرف ہندوستان ہی کے ساتھ مسلمانوں کا سلوک نہیں رہا بل کہ خاتم المؤرخین مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندوی نور اللہ مرقدہ نے دنیا میں مسلمانوں کی خدمات کو خراج تحسین دیتے ہوئے کیا خوب کہا ہے:

جب بھی اللہ نے کسی خطۂ ارض کے ساتھ خیر خواہی اور بھلائی کا ارادہ کیا اور انہیں ظلمتوں سے نکال کر نورانیت سے بہرہ ور کرنا چاہا اور ان کو گم نامی سے نیک نامی میں شہرت دینے کا ارادہ کیا اور انہیں غیر متمدن اور غیر مہذب زندگی سے دور کر کے مہذب اور متمدن زندگی سے لطف اندوز کرنے کا ارادہ کیا، ان کی جہالت کی تاریکی کو علم کے نور سے منور کرنا چاہا تو مسلمانوں کو اسی خطہ میں بھیج دیا، بس پھر کیا تھا، مسلمانوں نے اس خطہ کو اپنا وطن بنالیا، اپنی ساری علمی، فکری، ذہنی، سیاسی صلاحیتوں کو اسی کی ترقی کے لیے قربان کردیا، بل کہ اپنی جان کی بازی لگادی اور زبان حال سے گویا یہ کہا کہ

ع...... ہر ملک ملکِ ما است کہ ملکِ خدائے ما است

دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھو! جب بھی کوئی اجنبی قوم کسی نئے خطے میں پہنچی تو اس نے اس خطہ کے ساتھ ایسا سلوک کیا جیسے ” بقرة حلوب“اور”ناقة ركوب“ کے ساتھ کرتے ہیں، یعنی دودھ دینے والے گائے اور سواری کے اونٹ کی طرح کہ اس کا دودھ بھی پیتے ہیں، اس پر سواری اور مال برداری کرکے کام نکال لیتے ہیں اور پھر اسے بے سہارا چھوڑ دیتے ہیں اور مسلمانوں نے الحمد للہ! جہاں گئے وہاں کے مال وثروت کے ساتھ ایسا نہیں کیا، جیسا کہ دیگر اقوام نے کیا کہ اجنبی ملک سے مال و دولت کولوٹ کھسوٹ کر اپنے ملکوں میں پہنچایا، جیسے اسپنج کا حال ہے کہ ایک طرف سے پانی کو جذب کرتا ہے اور دوسری طرف سے اسے نکال دیتا ہے؛ بل کہ مسلمان جہاں گئے اسے اجنبی تصور نہیں کیا، بل کہ اپنا بنایا، وہیں زندگیاں کھپادیں، وہیں دفن ہوگئے، اپنے پاس جو بھی علمی، روحانی، اخلاقی، فکری سرمایہ تھا اور صلاحیت تھی اسے مقامی باشندوں میں فراخ دلی کے ساتھ تقسیم کردیا اور مقامی باشندوں میں جو صلاحیتیں پوشیدہ تھیں انہیں بھی اجاگر کیا، جو غلط استعمال ہورہی تھی اسے صحیح رخ دیا اور اسی طرح اس خطۂ ارض کو تہذیب وتمدن اور ثقافت وحضارت کا مینار بنادیا اور وہاں کی بنجر زمین کو زرخیز کردیا۔

پس مسلمانوں کا اس خطہ میں وارد ہونا برکات کے نزول کا سبب بن گیا اور پھر اس خطہ سے علوم کے چشمے پھوٹنے لگے اور پھر ایسا محسوس ہونے لگا جیسے مسلمانوں نے آکر اسے حیاتِ نو بخشی ہو۔

(الهند في العهد الإسلامي بحواله أضواء على الحركة العلمية والمعاهد الإسلامية والعربية في غجرات. ص ۲۱،۲۲)

جس طرح مسلمان جس خطۂ زمین پر گئے اسے ہر اعتبار سے مالا مال کیا، بالکل اسی طرح ہندوستان کے ساتھ بھی مسلمانوں نے عمدہ سلوک کیا، بعض غیر مسلم ہندوستانی قلم کاروں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔

اس حقیقت کا اعتراف سابق صدر کانگریس اور جنگ آزادی کے ایک رہنما ڈاکٹر پٹابی سیتارمیہ نے بھی کانگریس کے اجلاس جے پور میں اپنے خطبۂ صدارت میں ان الفاظ سے کیا:

”مسلمانوں نے ہمارے کلچر کو مالا مال کیا ہے اور ہمارے نظم ونسق کو مستحکم اور مضبوط بنایا، نیز وہ ملک کے دور دراز حصوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں کامیاب ہوئے، اس ملک کے ادب اور اجتماعی زندگی میں ان کی چھاپ بہت گہری دکھائی دیتی ہے۔“

(ہندوستانی مسلمان: ص۳۰)

ایک ہندوستانی فاضل جناب این، ایس، مہتا، (N.S.Mehta) صاحب آئی، سی، ایس اپنے ایک انگریزی مضمون (ہندوستانی تہذیب اور اسلام) میں اسلام کے فیوض واحسانات کا اس طرح تذکرہ کرتے ہیں:

”اسلام یہاں صرف ایک نورانی مشعل لایا تھا، جس نے زمانۂ قدیم میں جب کہ پرانے تمدن انحطاط پذیر ہورہے تھے اور پاکیزہ مقاصد محض ذہنی معتقدات بن کر رہ گئے تھے، انسانی زندگی کو چھائی ہوئی ظلمتوں سے پاک کردیا، دیگر ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی سیاست سے زیادہ خیالات کی دنیا میں اسلام کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا،

آج کی اسلامی دنیا بھی ایک روحانی برادری ہے، جس کو توحید اور مساوات کے مشترک عقیدے کا ایمانی رشتہ باہم منسلک کئے ہوئے ہے، بدقسمتی سے اس ملک میں اسلام کی تاریخ صدیوں تک حکومت سے وابستہ رہی، جس کی وجہ سے اسلام کی اصلی نوعیت پر پردہ پڑ گیا، اور اس کے فیوض نگاہوں سے مخفی ہو گئے۔‘‘

ان تاریخی حقائق کے پیش نظر صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے اس عظیم ملک کو جس قدر فائدہ پہنچایا وہ اس فائدہ سے بہت زیادہ ہے جو ہندوستان نے انہیں پہنچایا، مسلمانوں کی آمد اس ملک کی تاریخ میں ایک نئے دور ترقی وخوش حالی کا آغاز تھا، جسے ہندوستان کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

(ہندوستانی مسلمان: ص۳۳، ۳۴)

یہ تو ہوا ہندوستان پر مسلمان حکم رانوں کے کارناموں کا عمومی تذکرہ، شاہان گجرات بھی اپنے خطہ کی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے رہے، جس کا ذکر مولانا عبدالحی صاحب نے ’’یادایام‘‘ میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے، جس کے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

عدل وانصاف کا نمونہ:

آپ ایک طرف ان کو جہاد وغزا پر آمادہ پاتے ہیں تو دوسری جانب یہ نظر آتا ہے کہ اپنی رعایا کی خبر گیری میں ہمہ تن مصروف ہیں، ان کے معدلت وانصاف کے سامنے دوست ودشمن یکساں نظر آتے ہیں، اگر ان کا کوئی عزیز قریب بھی ارتکاب جرم کرتا ہے تو اس کو بھی وہی

سزا دی جاتی ہے جو کسی بیگانہ شخص کو دی جاتی، یا جو سزا اس جرم کی پاداش میں ملنی چاہیے تھی، احمد شاہ غفران پناہ کے داماد نے غرور جوانی میں خون ناحق کر دیا، بادشاہ کو خبر ہوئی، اس نے اس کو گرفتار کر کے قاضی کی عدالت میں بھیج دیا، قاضی صاحب نے بادشاہ کے داماد کو قصاص سے محفوظ رکھنے کے لیے مقتول کے وارثوں سے گفت وشنید کی اور ان کو بجائے ایک دیت کے دو دیت لے کر قاتل کو معافی دینے پر رضا مند کر لیا، ممکن ہے کہ وارثان مقتول پر بھی ہیبت سلطانی غالب آ گئی ہو، اور انہوں نے دیت مل جانے ہی کو غنیمت سمجھا ہو، بہر حال بادشاہ کو اس کی اطلاع دی گئی، فرمایا کہ وارثان مقتول گو دیت پر رضا مند ہیں، تاہم اس کو قبول نہ کرنا چاہیے، ورنہ دولت مندوں کو قتل ناحق پر دلیری ہو گی، یہ کہہ کر حکم دیا کہ مجمع عام میں قاتل کا سر اڑا دیا جائے۔

(یادایام ص۵۹، ۶۰)

ذرا غور کریں! وہ موجودہ حکم راں جو گجرات کی ترقی کے راگ الاپتے رہتے ہیں، کیا ان کے یہاں انصاف کی ایسی مثال مل سکتی ہے، ان کے اعمال تو ظلم و بربریت سے بھرے ہوئے ہیں!! وہ کیا ہمارے مسلمان حکم رانوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں، نہ ان سے پہلے کسی نے ایسی حکم رانی کی اور نہ ان کے بعد کوئی کر سکا، اللہ انہیں اس کا بہتر بدلہ عطا فرمائے۔

صرف عدل وانصاف ہی نہیں، گجرات جو آج مختلف پھلوں اور پھولوں کا زبردست گہوارہ ہے وہ بھی ہمارے حکم رانوں کی برکت ہے۔

اصلاحاتِ ملکی:

اس انصاف ومعدلت کے ساتھ حکم رانی کرتے ہوئے آپ ان کو پائیں گے کہ وہ رعایا کی خبر گیری، یتیموں اور بیواؤں کی دستگیری، علما ومشائخ کی حوصلہ افزائی اور ملک کی سرسبزی وشادابی کے بہترین مشغلوں میں مصروف ہیں، جھاڑیوں اور جنگلوں سے ملک صاف کیا جاتا ہے، شہروں اور قصبوں کی آبادی کی کوشش ہوتی ہے، عمارتیں بنتی ہیں، باغات تیار ہوتے ہیں، جو میوے اور پھول پھل اس وقت تک گجرات میں نہیں پہنچتے تھے وہ دور دراز مقامات سے منگوا کر لگائے جاتے ہیں، ایران وخراسان سے ہنر مند اور کاریگر بلائے جاتے ہیں، وہ فوارے اور آبشاریں لگاتے ہیں، بڑے بڑے وسیع وعمیق تالاب سنگ بست بنوا کر بیچ میں جزیرے چھوڑے جاتے ہیں، اوران میں ہرے بھرے باغ اور طرح دار عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں، جہاں کشتیوں کے ذریعہ سے انسان پہنچ کر روح میں بالیدگی اور دماغ میں شگفتگی کے سامان مہیا پاتا ہے، آم، انجیر، کیلا، سنگترہ، انگور، انار، کمرک، فالسہ، ناریل، جامن، آنولہ، کٹہل، بڑہل، کھرنی، اور پھولوں میں گلاب، سیتونی، چنپہ، چمیلی، بیلہ، موگرہ، جوئی، کتکی، کیوڑہ وغیرہ دور دور سے منگوا کر باغوں کو ان سے آراستہ کیا جاتا ہے، امرا چاہتے ہیں کہ ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں، یہ ہے ملک کی سرسبزی وشادابی کی تمنا، اسی پر قناعت نہیں کرتے، بل کہ اذن عام دیا جاتا ہے کہ جو میوہ اور درخت لگائے گا اس کو انعام دیا جائے گا، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک پیرزال کو بھی اس کی ہمت ہوتی ہے کہ وہ اپنے مکان کے آس پاس میوہ دار درخت لگائے اور انعام حاصل کرے۔

محمود شاہ اول کی حوصلہ افزائی یہاں تک بڑھتی ہے کہ اثنائے راہ کسی بے نوا کے دروازے پر بھی کوئی نہال نظر آتا ہے تو سواری روک لی جاتی ہے، اس کو بلا کر پوچھا جاتا ہے کہ تم پانی کہاں سے لاتے ہو، اگر وہ کہتا ہے کہ دور سے لانا پڑتا ہے تو اس کے لیے کنویں کی تیاری کا حکم دیا جاتا ہے اور اس کو کچھ روپیہ بھی عنایت ہوتا ہے کہ وہ بیش از بیش تر اپنے شغل کو جاری رکھ سکے، کوئی دوکان خالی نظر آتی ہے، یا کوئی مکان گرا پڑا دکھائی دیتا ہے تو مقدموں اور متصدیوں کو بلا کر ان سے دریافت کیا جاتا ہے کہ یہ غیر آباد کیوں ہے، پھر جو اسباب اس کی ویرانی کے ہوتے ہیں ان کو دور کر کے انتظام کیا جاتا ہے کہ از سر نو آباد ہو جائے۔

زراعت کی ترقی:

خربوزوں کی فصل میں فالیزوں کی کثرت اور فراوانی، کیلوں کے ہرے بھرے باغات، لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی شادابی اور ہر قسم کے اجناس کی پیداوار کو کچھ زمین کی مناسبت اور زیادہ تر ان بیدار مغز بادشاہوں کی نیک نیتی کا ثمرہ سمجھنا چاہیے، ایک زمانہ ایسا تھا کہ گجرات میں اچھے قسم کا چاول نہیں پیدا ہوتا تھا، بڑی پیداوار وہاں کی باجرہ، ارہر، موٹھ اور اسی قسم کی چیزوں کی تھی، عمدہ قسم کے اجناس کی کاشت کم ہوتی تھی، شاہان گجرات نے لوگوں کو حوصلہ دلایا، جا بجا سے تخم منگائے اور تقسیم کیے، چند دنوں میں عمدہ سے عمدہ قسم کا چاول وہاں پیدا ہونے لگا، نیشکر کی کاشت کو خوب ترقی ہوئی، اور رعایا کو کاشت کاری کی جانب ایسا میلان ہوا کہ جس قدر حصہ ملک کا مویشیوں کے

چرانے کے کام میں لانا چاہیے تھا، وہ بھی مزروعہ ہوگیا، مظفرشاہ حلیم کے زمانہ میں جب
اس وقت کولوگوں نے محسوس کیا تو بادشاہ سے شکایت کی اوراس کواپنے تمام قلمرو میں یہ
حکم نافذ کرنا پڑا کہ ہرگاؤں میں اس قدر زمین زراعت سے خالی چھوڑی جائے جس
میں مویشیوں کے واسطے چراگاہیں قائم ہوسکیں۔

صنعت وحرفت:

ان بادشاہوں کی روشن دماغی یہیں آکرختم نہیں ہوتی، بل کہ وہ آگے بڑھتے
ہیں، دنیا کی متمدن قوموں کو دعوت دیتے ہیں، جو کارخانے اصلاح طلب ہیں ان
میں اصلاحیں کرتے ہیں اور جن کاموں سے اہل گجرات اب تک نا آشنا ہیں ان
کاموں کے لیےنئی نئی راہیں ڈھونڈھتے ہیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گجرات میں صدہا کار
خانے کھل جاتے ہیں اورسیکڑوں طرح کی بیش قیمت و نادراشیا احمد آباد میں بننےلگتی
ہیں، سنگ تراشی، زردوزی، کارچوپ، چینی کا کام، صندل اور ہاتھی دانت کی نادر
اشیا، زربفت، کمخواب، مخمل، سقرلاط، الائچہ، چکن، اور چیرہ، ایسی چیزیں تھیں جو
ہندوستان میں نہایت بیش قیمت فروخت ہوتی تھیں، علاوہ ان کے احمد آباد کا کاغذ اتنا
عمدہ بنایا جاتا تھا کہ دولت آباد وکشمیر کا کاغذ باوجود دوسری طرح کی خوبیوں کے
نفاست وصفائی میں اس کے برابرنہیں سمجھا جاتا تھا۔

سنگ پٹھانی جو کوہستان ایدر سے برآمد کیا جاتا تھا اس کا چونہ چھتوں اور
دیواروں پر لگایا جاتا تھا، اس کو گجرات کے کاریگر اس طرح رگڑتے تھے جو آئینہ کی

طرح سے چمکنے لگتا تھا، اوراس میں صورت نظر آنے لگتی تھی، شاہجہاں نے قلعۂ معلّیٰ کی
عمارتوں میں اسی چونہ کی استرکاری کرائی تھی، جو سیکڑوں برس گزرجانے پر اب بھی
دیکھنے والوں کے واسطے آئینۂ حیرت ہے۔

(یادایام ص۶۰ تا۶۳)

میں سمجھتا ہوں کہ اب تک جو جو شہادتیں میں نے پیش کی ہیں، وہ اس بات کا
کافی ثبوت ہیں کہ شاہان گجرات کی ہمہ گیرطبیعت اور بےمثل فیاضی نے گجرات کو ہر
قسم کی صنعتوں اورحرفتوں کا مرکز بنادیا تھااورانہیں خصوصیتوں کے لحاظ سے ہندوستان
کا کوئی حصہ اس سے لگاّ نہیں کھاتا تھا، امین رازی کا احمد آباد کی نسبت یہ کہنا کہ ”
بحسب لطافت وکیفیت آبادی وشہریت برتمام ولایت ہندرجحان دارد“ یا عالمگیر مرحوم
کا گجرات کو ”زیب وزینت ہندوستان“ قرار دینا بڑی وقیع شہادتیں ہیں، ان میں
سے ایک وہ ہے جو اس ایران کا باشندہ ہے، جس کی عنان حکومت سلاطین صفویہ کے
ہاتھوں میں تھی اوراپنی تہذیب وتمدن کے اعتبار سے اس وقت ساری دنیا سے ممتاز
سمجھا جاتا تھا، دوسرا وہ ہے جو ہندوستان کا سب سے بڑا فرماں روا ہے، بلخ وبدخشاں
سے لے کر ایک جانب ساحل کارومنڈل تک اور دوسری جانب آسام تک تمام ملک
اس کے زیرنگیں ہے، اس کے مقبوضات کے متعلق اس سے بہتر کوئی شخص رائے قائم
نہیں کرسکتا؛ مگر۔

یہ باتیں ہیں، جب کی کہ قائم جواں تھا۔

(یادایام ص۶۷ تا۶۸)

خلاصۂ کلام یہ کہ گجرات کی ترقی میں کلیدی کردار اور اہم رول مسلمان حکم رانوں کا ہے،آج کے مؤرخین اور سیاست داں اگر چہ اسے نظر انداز کر رہے ہیں؛مگر تاریخ کے صفحات پر ان کے کارنامے مرقوم ہیں اور وہ ہمیشہ اپنے بہترین کارناموں کی وجہ سے زندۂ جاوید رہیں گے اور آج کے رشوت خور حکمراں چاہے پبلسٹی کے ذریعہ یا میڈیا کے ذریعہ انہیں کتنی ہی تشہیر کرتے رہیں اور اپنے کردار کو چھپانے کی کوشش کرتے رہیں؛مگر تاریخ ہمیشہ منصف ثابت ہوئی وہ کبھی انہیں بخشے گی نہیں، وہ اپنے کردار پر ہی یاد کئے جائیں گے۔

بہر حال دنیا کی تاریخ آپ اٹھا کر دیکھیں، چاہے عہد قدیم کی تاریخ ہو یا عہد جدید کی آپ کو اس بات کی صداقت کا اعتراف کرنا ہوگا کہ ''اقوام عالم'' میں صرف مسلمان ہی وہ ہیں جو جس خطہ میں گئے اسے اپنا وطن بنایا، اس کی ترقی کے لیے اپنے جان مال کی بازی لگا دی اور اپنی فکری، عقلی، مالی، جسمانی، روحانی، اخلاقی تمام صلاحیتوں کو خطہ کی ترقی کے لیے صرف کر دیا اور دنیا کے بے شمار خطوں کو سرسبز و شاداب کر دیا، اس لیے مسلمانوں نے جن خطوں پر حکومتیں کیں، مسلمانوں کے وہاں کے سیاسی میدان سے دور ہونے کے بعد وہاں کوئی ''یوم آزادی'' نہیں منایا جاتا؛ کیوں کہ انہوں نے لوگوں کو غلام نہیں بنایا، کسی کی آزادی مجروح نہیں کیا، ہندوستان ہی کو لیں، جہاں مسلمانوں نے تقریباً ایک ہزار سال حکومت کی؛ مگر یہاں کے لوگوں کو نہ غلام بنایا، نہ ہندوستان کی مال و دولت کو لوٹ کھسوٹ کر اپنے وطن لے گئے بل کہ ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا،

مسلمان بادشاہ ہی صرف یہاں دفن نہیں ہوئے، ان کی نسلوں کی نسلیں یہاں دفن ہو گئیں، برطانیہ، فرانس اور پرتغالیوں کی طرح نہیں کہ ہندوستان کے لوگوں کو غلام بنایا، انہیں پکڑ کر اپنے دیگر مقبوضہ علاقوں میں لے گئے، وہاں انہیں غلامی سے زیادہ ذلت بھری زندگی گزارنے پر مجبور کیا، بے دردی سے ہندوستانیوں کا قتل کیا، ان کی مذہبی آزادی کو ختم کیا، ہندوستان سے جاتے ہوئے بھی مختلف اقوام کو آپس میں لڑوایا اور ناقابل بیان حد تک لوگوں پر مظالم ڈھائے، یہاں تک کہ ہندوستانی لوگوں کو مذہبی تعلیم سے دور کیا، مغرب کے ملحدانہ افکار و خیالات کو ہندوستانیوں پر تھوپ دیا اور انگریزوں نے یہ سب صرف دوسو سال سے بھی کم عرصہ میں کیا، اگر انہیں مسلمانوں کی طرح ۸۰۰ر سال حکومت کا موقع ملتا تو پتہ نہیں کیا ہوتا، شاید امریکہ کی طرح ہندوستان سے بھی یہاں کے باشندوں کا خاتمہ ہو جاتا، یہ تو مسلمانوں کے حوصلے تھے کہ انہیں یہاں چین سے نہیں رہنے دیا، مزاحمت کر کے یہاں سے بھاگنے پر مجبور کیا، اگر انہوں نے کچھ ریلوے اور سڑکیں بنائیں بھی تو یہ کوئی ہندوستان پر ان کا احسان نہیں تھا، کیوں کہ جو ہندوستانیوں سے لوٹا تھا اس کا بہ مشکل دس فی صد ہندوستان پر انہوں نے صرف کیا، بقیہ تو سب لوٹ کھسوٹ کر اپنے دیار لے گئے اور اتنا لے گئے کہ آج بھی اسی لوٹے ہوئے اموال سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مسلمان کا ہندوستان کی ترقی میں کلیدی کردار ہے، اگر آج بھی مسلمان یہاں ہوتا تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ ملک دنیا کے صف اول میں ہوتا،

کیوں کہ جمہوریت کے نام پر انگریز ایسا نظام دے کر گیا ہے کہ اس میں سوائے دھاندلیوں کے کچھ نہیں ہوتا، مسلمانوں کے دورِ حکم رانی میں یہاں کوئی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا، اس طرح کی جو بھی دھاندھلیاں اور بڑے بڑے گھپلے ہوئے یہ سب آزادی کے بعد ہوا، گویا ہندوستانی اقوام آج بھی ذہنی، فکری اور سیاسی طور پر انگریزوں کی غلام ہے، اللہ اس ملک کی فتنہ پروروں اور لٹیروں اور ظالموں سے حفاظت فرمائے اور امن و امان کی فضائیں قائم کرے اور ملک کے باشندوں کو صحیح شعور اور سمجھ عطا فرمائے، اور بھائی چارگی کے ساتھ زندگی گزارنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین!

سرزمین گجرات، اسلام اور مسلمان:

جیسا کہ اس سے قبل ”تاریخ فرشتہ“ کے حوالہ سے ذکر کیا گیا کہ ہندوستان کو ہندوستان کہنے کی وجہ حضرت نوح علیہ السلام کے پوتے ہند کی طرف نسبت کرتے ہوئے ہے کہ ان سے یہ ملک آباد ہوا، محض تاریخی روایت کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام نے بھی یہاں سکونت اختیار کی ہے تو اس صورت میں سرزمین ہند کے اولین باشندے مسلمان ہیں؛ بل کہ نبی اور ابوالبشر آدم علیہ السلام کا مسکن ہی ہندوستان ہے۔

رہا مسئلہ گجرات کا تو ”مقدمۂ تاریخ گجرات“ کے مصنف کے بیان کے مطابق حضرات انبیا علیہم السلام کے زمانے میں سونا، چاندی، جواہرات اور عمدہ خوشبو گجرات کی بندرگاہوں سے جاتی تھی، اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں بھی تجارتی اشیا گجرات سے فلسطین جاتی تھی، جس کا تذکرہ مؤرخین نے کیا ہے،

بل کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دور میں اور اس کے بعد اخیر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں بھی گجرات کی بندرگاہوں سے سرزمین عرب کے تجارتی تعلقات کا پتہ چلتا ہے، اس کے بعد بھی یہ تعلقات بڑھتے رہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے بعد مزید مستحکم ہوگئے۔

جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کی بہتری کا راز:

قارئین یہ سوچ رہے ہوں گے کہ مقالہ نگار نے یہ کیا بحث چھیڑ رکھی ہے، پہلے دنیا کا جغرافیہ اور پھر افریقہ وجنوبی افریقہ کا جغرافیہ اس کے بعد ہندوستان اور گجرات کا جغرافیہ اور تاریخ!!! اور سفر نامہ کا ابھی تک کوئی اتا پتا نہیں؟؟؟ تو ان شاء اللہ اب سفر نامہ کا آغاز ہونے جا رہا ہے۔ دراصل میری کوئی حیثیت نہیں جو اپنا سفر نامہ قلم بند کروں، اصل مقصد امت کے پیچیدہ حالات سے واقفیت اور مغرب کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کا تدارک ہے، اس سفر نامہ کا مقصد بھی یہ ہے کہ آج دنیا میں تقریباً ۱۵۰؍ ممالک میں مسلمان اقلیت میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، جہاں وہ گوناگوں آزمائشوں میں مبتلا ہیں؛ مگر جنوبی افریقہ کا مسلمان سب کے مقابلہ میں عمدہ زندگی گزار رہا ہے، جو ہمارے لیے نمونہ ہے، اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں:

(۱)......جنوبی افریقہ کا مسلمان اپنے مذہب پر مضبوطی کے ساتھ جما ہوا ہے۔

(۲)......جنوبی افریقہ کے مسلمان نے جنوبی افریقہ میں تجارت پر اپنا اثر ورسوخ حاصل کر رکھا ہے۔

بعثت عیسیٰ علیہ السلام سے ۲۰۰ سال قبل عرب اور گجرات کے تجارتی تعلقات:

مؤرخین کے بیان کے مطابق حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا پہلا دستہ گجرات کے بھروچ اور موجود تھانہ کے سمندری راستہ سے وارد ہوا، جو زمانۂ قدیم میں گجرات کا حصہ تھا، سرزمین گجرات چوں کہ بحرِ عرب کے کنارے پر واقع ہے ،لہٰذا صحابہؓ کا ورود معقول بھی ہے؛ کیوں کہ گجرات اور عرب کے تعلقات اسلام کے آنے سے پہلے ہی سے تھے، جیسا کہ علامہ سید سلیمان ندویؔ رحمہ اللہ نے یونانی مؤرخ ''آگاتھریشیدش'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سواحلِ سورت جو ہندوستان کا ایک مشہور شہر ہے، جہاں یمن کے لوگ تجارتی جہاز کے ذریعہ قوم سبا سے آتے تھے اور پھر مصر جاتے تھے، یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے دوسو سال قبل کی بات ہے۔

(عرب و ہند کے تعلقات بحوالہ مقدمہ تاریخ گجرات: ص۳۳)

گجراتی بادشاہ کا شق قمر کے موقع پر اسلام:

بہر حال گجرات سرزمین عرب سے قرب مکانی کی بنا پر اسلام کا اولین مرکز رہا، ساتھ ہی ساتھ تجارتی منڈی اور عربوں کے تجارتی ذوق کی وجہ سے بھی ان کا گجرات تجارت کے لیے آنا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے بیان کے مطابق حضرات صحابۂ کرامؓ کے دور سے قبل ہی یہاں کا ایک بادشاہ شق قمر کے بعد مشرف بہ اسلام ہوگیا تھا اور اسی مکی عہد میں ایک صحابی ان کے مطالبہ پر ان کو

دین سکھانے کے لیے تشریف لائے تھے اور حکیم الامتؒ کے بیان کے مطابق دونوں کی قبریں یعنی بادشاہ اور صحابی کی گجرات میں ہیں اور اس میں کچھ نہ کچھ درجہ صداقت بھی محسوس ہوتی ہے، کیوں کہ کاٹھیاواڑ، بھاؤنگر کے قریب واقع ایک گاؤں ''گوگا'' میں چند سال قبل بندے نے خود ایک ذو قبلتین مسجد دیکھی، ...... پہلے بیت المقدس کی سمت اور بعد میں تحویل قبلہ کے بعد کعبۃ اللہ کے سمت اس میں نماز پڑھی گئی، اس کے دو جانب محراب ہے۔ واللہ أعلم بحقیقة الحال!

مذکورہ تفصیلات عربی مراجع میں نہیں ؛مگر فارسی مراجع میں حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے مطابق موجود ہے۔

صحابۂ کرامؓ کا ورود گجرات میں:

اب تو تقریباً یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ صحابہؓ کا پہلا دستہ جسے حضرت عثمان ابن ابی العاص الثقفیؓ نے بحرین سے حضرت حکم ابن ابی العاص الثقفیؓ کی سرکردگی میں بھیجا تھا وہ تھانہ اور بھروچ ہی پہنچا تھا؛ جیسا کہ مؤرخِ ہند مولانا عبدالحی حسنی والد ماجد مولانا علی میاں ندوی رحمہما اللہ، اسی طرح قاضی اطہر مبارک پوریؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالجبار اعظمیؒ، مولانا ابوظفر ندویؒ وغیرہ نے ثابت کیا ہے، اسی پر بس نہیں عصرِ حاضر میں جامع یرموک اردن کے ایک پروفیسر ڈاکٹر احمد محمد الجوارنہ نے ''المعارك الإسلامية في الهند'' کے نام سے تقریباً دوسو صفحات پر مشتمل کتاب مرتب کی،

جس میں ہندوستان پر مسلمانوں کے کیے گئے حملوں کی تاریخ بڑے سلیقہ سے جمع کردی ہے، ان کے بیان کے مطابق خلفائے راشدین کے دور سے لے کر انیسویں صدی تک مسلمانوں نے جو معرکے ہندوستان میں سر کیے، ان کی تعداد ۲۸۶ ہے اور ان میں سب سے پہلا غزوہ ذکر کیا ہے وہ ہے ''غزوۂ تانہ'' سنہ ۱۵ھ / ۶۳۶ء اور دوسرا ''غزوۂ بروص'' اسی سال حضرت حکم بن ابی العاص الثقفیؓ کی سرکردگی میں اور اسے مؤرخ بلاذری کے حوالہ سے مدلل کیا ہے۔

(المعارک الإسلامیة في الهند ص ۱۰)

سورت کی بندرگاہ کا ۸۸ر ملکوں سے رابطہ:

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہ نے تو ثابت کیا کہ سورت ممبئی سے پہلے ''باب المکة'' سے بھی جانا جاتا تھا، ممبئی کے عروج سے پہلے زائرینِ حرم کی پہلی منزل سورت تھی، تاپتی اور نرمدا در اصل بحر عرب کی دو نالیاں ہیں۔

(مقدمۂ تاریخ گجرات: ص ۳۶)

گجراتی زبان میں ''تواریخ نوساری'' کے مصنف کے بیان کے مطابق گجرات کی صرف سورت بندرگاہ کا دنیا کے ۸۸ر ممالک اور شہروں سے رابطہ تھا، جس میں کولمبو، رنگون، ایران، مدینہ، بصرہ، مڈغاسکر، کیپ ٹاؤن، پرتغال، مسقط، صومالیہ، برطانیہ، ہالینڈ، آرمینیہ، جرمن، روم، مکہ، موزنبیق، اسپین، مصر وغیرہ کے نام درج ہیں۔

(تواریخ نوساری ص ۶۴۹ بحوالہ مقدمۂ تاریخ گجرات ص ۵۹)

گجرات کی بوہرہ قوم:

جنوبی افریقہ کے سفر میں بندے کا سابقہ جن علما اور تاجروں سے پڑا، وہ سب گجرات کی بوہرہ برادری سے تعلق رکھتے ہیں اور ناکارہ کا تعلق بھی اسی برادری سے ہے۔ بوہرا دو طرح کے ہیں: (۱) سنی بوہرہ (۲) شیعی بوہرہ۔ سنی بوہرہ کی تعداد زیادہ ہے اور یہ عام طور پر بھروچ اور سورت کے اطراف کے علاقوں میں اور خاص طور پر ان کے اصل وطن نرمدا اور تاپتی ندی کے کنارے واقع دیہاتوں میں ہیں؛ جس کی وجہ سے انہیں عربی النسل مانا جاتا ہے، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں ''گجراتی مسلمان کے عربی النسل ہونے کی میرے پاس دو دلیلیں ہیں'':

(۱)...... ان کی مہمان نوازی اور دسترخوان کی کشادگی۔

(۲)...... تجارت کے ساتھ دعوت دین کا جذبہ۔

صحابہؓ میں بھی یہی صفات تھیں کہ تجارت کی غرض سے پوری دنیا میں پھیلے اور اسلام کو بھی عام کیا اور گجراتی مسلمان میں بھی یہ اوصاف ایک حد تک اب بھی پائے جاتے ہیں۔

(مقدمۂ تاریخ گجرات: ص ۲۳)

مذکورہ دو اوصاف کے ساتھ ''مقدمۂ تاریخ گجرات'' کے مصنف مولانا ایوب سورتی ماکھنگوی حفظہ اللہ نے مزید دو دلیلوں کا اضافہ کیا ہے۔

[۱]...... بوہرہ قوم کے دیہاتوں میں بہ کثرت کھجور کے درختوں کا پایا جانا، کیوں کہ صحابہؓ اور عرب حضرات اپنے ساتھ کھجور لائے ہوں گے اور اس کے بیجوں کو بکھیر دیا ہوگا۔

[۲]...... گجراتی مسلمانوں کے نام بہ کثرت انبیا اور صحابہ کرامؓ کے نام پر ہیں، جو ان کے عربی النسل ہونے پر دلالت کرتا ہے، جیسے میرے والد ماجد کا نام غلام دادا کا نام اسماعیل، ان کے بھائیوں کے نام، آدم، محمد، موسیٰ، پردادا کا نام ابراہیم، سکڑ دادا کا نام محمد اور اکثر ہمارے علاقوں میں ایسے ہی نام ہوتے ہیں۔

بندہ کے ذہن میں بھی کچھ دلائل ہیں:

[۳]...... بوہرہ برادری کی شکلیں بھی اہل عرب سے ملتی جلتی ہیں، میری بہ کثرت عربوں سے ملاقات ہے، جب بھی میں انہیں اپنی تاریخ بتلاتا ہوں تو وہ برجستہ کہتے ہیں، تمہاری شکل اور رنگت بھی ہمارے مشابہ ہے؛ بل کہ جدید تاریخِ انساب کی تحقیق کے مطابق بوہرہ برادری کے دسیوں خاندانی نام عربی الاصل ہیں، جو اپنی شکلیں تبدیل کر چکے ہیں، ”مقدمۂ تاریخِ گجرات“ کے مؤلف نے مولانا یوسف صاحب موتالا دامت برکاتہم کے حوالہ سے تقریباً ۶۰ر بوہرہ خاندانوں کے موجودہ ناموں کی اصل عربی اور عرب کے کس قبیلہ کی کس شاخ سے اس کا تعلق ہے اس کو ثابت کیا ہے۔

مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند پیش خدمت ہیں:

BASSA	جس کا تعلق عدنان کے بنی دارم سے ہے۔
SALEH	عدنان کی شاخ بنو عبد المطلب سے ہے۔
MAJI	قحطان کی شاخ زغبۃ سے ہے۔
ADAA	قحطان کی شاخ النخع سے ہے۔
SADAR	قحطان کی شاخ لخم سے ہے۔
KARA	بنی خزیمہ کی شاخ عضل سے ہے۔
AMLA	بنی عمر کی شاخ الخضر ان سے ہے۔
MALJI	عراق کی شاخ الصلیب سے ہے۔
JASAT	کا تعلق عراق کے خاندان سے وغیرہ۔

خلاصۂ کلام یہ کہ علامات، قرائن اور دلائل کی روشنی میں بوہرہ برادری کا تعلق عربوں اور صحابہؓ سے ہونا ثابت ہوتا ہے۔ **واللّٰہ أعلم بحقیقۃ الحال!**

گجراتی مسلمان کے بارے میں اکابرین کے تاثرات:

حضرت قاری طیب صاحبؒ نے فرمایا بیرونِ ملک، میرے میزبان گجراتی حضرات ہی ہوتے ہیں اور ارشاد فرماتے تھے: گجراتی مسلمان جہاں کہیں بھی گئے اپنی تہذیب، تعلیم، تبلیغ اور مذہبی روایات کو باقی اور زندہ رکھا؛ مدارس و مساجد کا ہر جگہ انتظام کیا اور تفریحاً فرماتے: روحانی غذا کے ساتھ جسمانی غذا بھیجیے، پکوڑے، سموسے، اور کڑھی

کھچڑی بھی اپنے ساتھ لے گئے۔اسی طرح مفتیِ اعظم حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ ،علامہ بنوریؒ ،حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ ،حضرت تھانویؒ ،مفتی کفایت اللہ صاحبؒ ،علامہ انور شاہ کشمیریؒ ،علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت مدنیؒ وغیرہ کی خدمت کا موقع اللہ نے گجراتی مسلمانوں کو دیا اور آج بھی الحمد للہ اکابرین مثلاً: شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی ،مفتیِ اعظم مولانا محمد رفیع عثمانی ،مبلغ اعظم حضرت مولانا طارق جمیل صاحب وغیرہ کی میزبانی میں بھی گجراتی مسلمان پیش پیش ہیں ، مولانا طارق جمیل صاحب نے تو اپنے ایک بیان میں کہا کہ ’’دنیا کی واحد قوم گجراتی ہے،جس نے اپنے مذہب سے تعلق برقرار رکھا ، جہاں گئے مسجد اور مدرسے تعمیر کیے اسی طرح مولانا سید عدنان کاکاخیل فرماتے ہیں:

ہندوستانی گجرات سے تعلق رکھنے والے عام طور پر تجارت وکاروبار سے تعلق والے یہ مسلمان دنیا کے ہر خطے تک پہنچے ہیں،اور ایک بڑی نرالی شان سے پہنچے ہیں،جس پر مجھے آج سے نہیں،بل کہ کافی عرصے سے خاصا تعجب ہے۔

گجراتی مسلمان خواہ امریکا میں ہوں یا برطانیہ،کینیڈا میں ہوں یا ساؤتھ افریقہ میں ،موزمبیق میں ہوں یا زمبابوے میں، کینیا میں ہوں یا دنیا کے دوسرے سِرے بارباڈوز میں،ان میں چند قدریں حیرت انگیز طور پر مشترک ہیں: پہلی بات تو یہ کہ ان کا دین سے تعلق غیر معمولی طور پر مضبوط و مستحکم ہے،شرعی لباس ، وضع قطع ، پردے اور حیا کا ماحول اور اپنی اگلی نسلوں کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے شان دار اداروں کا قیام ، نیز مسجد کے ادارے کو مضبوط و مستحکم کرنے کی جو شان دار روایات گجراتی مسلمانوں میں ہیں،وہ صرف اور صرف انہیں کا خاصہ ہے۔

آپ امریکا میں جا کر دیکھیں ، برطانیہ اور لندن کی گجراتی آبادیوں کا جائزہ لیں یا افریقہ کے ملکوں موزمبیق ، کینیا ، زمبابوے وغیرہ میں دیکھیں ،تو آپ کو یہ خوش گوار حیرت ہوگی کہ گجراتی مسلمان ایک تو اپنی زبان اور کلچر سے گہری وابستگی رکھتے ہوں گے ۔ دوسرا ان کی ہر آبادی میں مسجد ، ہر مسجد میں مکتب ،مکتب میں تمام بچوں کی حاضری اور وہاں دینی تعلیم کے معقول بندوبست اور پھر اس تعلیم کا نوجوان بچوں اور بچیوں پر بہت اچھا اثر ،خوش حال اور غیر معمولی آسودہ حال گھرانوں میں حفاظ اور علما کی کثرت ، دیوبند، ڈابھیل، سہارن پور کے مدارس سے غیر معمولی وابستگی ، یہ تمام امور شاید ہی دنیا کی کسی اور قوم میں اجتماعی طور پر من حیث القوم موجود ہوں۔

آپ دنیا کے آخری سرے پر واقع ڈھائی لاکھ کی چھوٹی سی آبادی اور چند مربع کلومیٹر کے مختصر سے جزیرے بارباڈوز کو لے لیجیے، یہ دنیا کے مختصر ترین ملکوں میں سے ہے؛ یہاں مسلمانوں کی کل تعداد ۴ ر ہزار ہے جو کہ تقریباً تمام ہی گجراتی ہیں، یہ اس ملک کے کاروبار اور تجارت پر مکمل طور پر چھائے ہوئے ہیں اور بے حد آسودہ حال ہیں، ان چار ہزار مسلمانوں میں سے شاید ہی کسی کے گھر میں بے پردگی ہو۔ پندرہ سال قبل جب حضرت والا حضرت مفتی رشید احمد صاحب قدس سرہ وہاں گئے تھے تو حضرت کو بتایا گیا کہ یہاں جتنے گجراتی مسلمان بستے ہیں، ان میں سے کوئی ڈاڑھی منڈا نہیں ہے اور تمام خواتین باپردہ ہیں؛ چار ہزار کی آبادی میں ۸۰ ر علما اور ۲۰۰ ر حفاظ ہیں، جو پوری دنیا میں فی مربع کلومیٹر علما و حفاظ کی سب سے بڑی تعداد ہے۔

پوری دنیا کے دینی تعلیمی اداروں کو ان گجراتی مسلمانوں کی سر پرستی حاصل ہے؛ انہوں نے علما و مشائخ کی میزبانی اور قدر دانی کی وہ روایات قائم کی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے؛ میں نے لندن کے ایک گجراتی مفتی صاحب سے بطور خاص پوچھا کہ اس قوم کے اسلاف اور آباء واجداد سے وہ کون سا بھلا کام ہوا تھا، جس کا صلہ اس شکل میں قدرت کی جانب سے دیا گیا ہے؟ تو مفتی صاحب نے بڑی عجیب بات بتائی، انہوں نے کہا کہ یہ قوم ابتدا ہی سے Institutionalise ہے۔ انہوں نے دین سے اپنے تعلق کو ذاتی تعلق نہیں رہنے دیا، بل کہ اس کو ایک اجتماعی، ملی اور قومی فریضہ بنا دیا؛ اگر چند گجراتی مسلمان بھی دنیا کے کسی کونے میں گئے تو انہوں نے وہاں اجنبی ماحول اور بے دین گرد و پیش سے ایک لمحہ کے لیے متاثر ہوئے بغیر فوراً ایک چھوٹے سے دینی ادارے کی بنیاد رکھ دی۔ چند گھروں کے ساتھ ایک مسجد بنا دی۔ مسجد میں دارالعلوم دیوبند، ڈابھیل، سہارن پور یا بنوری ٹاؤن کے فاضل کسی عالم کو لے آئے اور اسکول سے واپسی پر اکثر بچوں کو جز وقتی اور بعض بچوں کو کل وقتی اسی ادارے سے وابستہ کر دیا۔

پوری آبادی میں کوئی گھر ایسا نہ ہوگا جس کا بچہ مکتب یا مدرسہ نہ جاتا ہو، یہ جز وقتی بچے ایک اچھے مسلمان تاجر، ڈاکٹر اور انجینئر بنتے ہیں اور کل وقتی طور پر وابستہ بچے پاکستان یا ہندوستان سے اعلیٰ دینی تعلیم کی تکمیل و تخصص وغیرہ کر کے بہترین عالم اور مفتی بنتے ہیں؛ ان کی آبادیوں میں شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو، جس میں کوئی نہ کوئی حافظ قرآن نہ ہو، اس ادارہ سازی کی عادت یا فطرت نے پوری دنیا کی مسلم کمیونٹیز میں گجراتی مسلمانوں کو ایک نمایاں انفرادی مقام عطا کیا ہے، جس میں دیگر لوگوں کے لیے عبرت بھی ہے اور نصیحت بھی۔

(ض۔م۔)

بہر حال یہ فخر کی بات تو نہیں، البتہ سعادت مندی اور اللہ کی توفیقِ خاص اور فضلِ عظیم ہے کہ فتنوں کے ایسے پر خطر دور میں اللہ گجراتی مسلمانوں سے اپنے دین کا کام لے رہا ہے، پورے اہل سنت والجماعت کی تحریکوں کو خاص طور پر دنیا بھر کے مدارس کو گجراتی مسلمانوں کا بھر پور تعاون حاصل ہے، جس میں گجراتی مسلمان کے ابنائے صحابہؓ میں سے ہونے اور گجراتی مسلمانوں کے سلف کا علما اور نیکوں کے ساتھ محبت کا بڑا دخل ہے، عصر حاضر کی گجراتی نسل ﴿وکان أبوهما صالحا﴾ کا گویا مزا لوٹ رہی ہے، اللہ ہمارے آباء واجداد کو اجرِ عظیم سے نوازے کہ ان کی نیکیوں کا ثمرہ آج ان کی نسلوں کو مل رہا ہے اور موجودہ نسل کو بھی اپنے ان ہی نیک آباء واجداد کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، تا کہ یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا رہے۔ آمین!

اسی لیے آج الحمد للہ! گجرات میں بڑی تعداد میں علما ہی نہیں امت کے صف اول کے علما بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً مولانا سعید احمد صاحب پالنپوری، مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی، مولانا عمر صاحب پالنپوری، مولانا احمد لاٹ صاحب، مفتی احمد بیمات صاحب، والد ماجد مولانا غلام محمد وستانوی صاحب وغیرہ۔ اللہ ان کی عافیت کے ساتھ عمر دراز فرمائے اور ہم سب کو ہمیشہ دین سے والہانہ محبت کرنے والا اور اخلاص کے ساتھ دین وامت کی خدمت کرنے والا بنائے۔ آمین یا رب العالمین!

ساؤتھ افریقہ کی زیارت:

شعبان کے دوسرے ہفتہ میں جامعہ کے سالانہ جلسے کے بعد ناکارہ سعودی ایئر لائنس کے ذریعہ اپنے چچازاد بھائی حافظ صدیق پٹیل نرولی کے ہمراہ ممبئی سے جدہ ہوتے ہوئے جوہانسبرگ پہنچا، جس دن وہاں پہنچا اسی دن اتفاق سے جنوبی افریقہ کے مشہور ومقبول قدیم ادارے ''دارالعلوم زکریا'' کا سالانہ اجلاس تھا، جس میں پیرذوالفقاراحمد صاحب نقشبندی تشریف لائے ہوئے تھے، بندے نے موقع کو غنیمت جانا اور جلسہ میں شرکت کی خواہش میزبان اور اپنے چچازاد بھائی سلیم یعقوب رندیرا کے سامنے ظاہر کی؛ موصوف نے فوراً کہا بالکل! کیوں نہیں؟ دارالعلوم ہم سے زیادہ دور بھی نہیں، وہ ''روشنی'' میں رہتے ہیں، بہرحال ہم تقریباً دس بجے کے قریب ''دارالعلوم زکریا'' کے احاطہ میں داخل ہوئے، ادارے کو دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی، ہم جیسے ہی پہنچے، تو وہاں گاڑی سے اترتے ہی حافظ بشیر باٹھیا صاحب سے ملاقات ہوگئی، جو ''دارالعلوم زکریا'' کے بانیوں میں سے ہیں، بل کہ غالباً انہیں کے چچا کا قائم کیا ہوا ادارہ ہے، ساتھ ہی موصوف والدمحترم کے دیرینہ دوست بھی ہیں اور جنوبی افریقہ میں والد صاحب کے میزبان بھی؛ بل کہ جامعہ کی تاسیس کے وقت جامعہ کے اولین معاونین میں سے ہیں، ظاہر سی بات ہے اتنی ساری نسبتوں کی وجہ سے انہوں نے پرتپاک استقبال کیا، برادرِ محترم سلیم کو وہ پہلے سے جانتے تھے، انہوں نے میرا تعارف کروایا تو مسرت کا اظہار کیا، خود جلسہ گاہ میں لے گئے، جب اندر

داخل ہوئے تو دیگر بہت سے احباب سے ملاقات ہوئی؛ مولانا شبیر صاحب سالوجی سے بھی ملاقات ہوئی، جو ادارہ کے مہتمم ہیں، انہوں نے کہا کہ اسٹیج پر تشریف رکھیے، بندے نے معذرت کردی، بعدہ دارالعلوم کے شیخ الحدیث مولانا مفتی رضاء الحق صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اصرار کرکے بندے کو اسٹیج پر بٹھایا، جلسہ شروع ہوچکا تھا، طلبہ نے بہت عمدہ پروگرام پیش کیا، اس کے بعد مولانا شبیر صاحب نے رپورٹ پیش کی اور اخیر میں پیرذوالفقاراحمد صاحب نقشبندی دامت برکاتہم کا بیان ہوا، بخاری کا مختصر درس ہوا، طلبہ کے درمیان فضیلت کی سند تقسیم کی گئی اور اس طرح اجلاس اختتام کو پہنچا، ماشاء اللہ اجلاس کامیاب رہا، کافی تعداد میں عامۃ المسلمین نے شرکت کی، اجلاس کے بعد جان پہنچان رکھنے والے افراد سے ملاقات ہوئی، حضرت پیر صاحب سے شرف لقاء حاصل ہوا، حضرت سے پہلے ہی سے شناسائی ہونے کی وجہ سے فوراً حضرت نے پہچان لیا اور والد صاحب کی خیرخیریت دریافت کی، بندے نے کہا الحمدللہ ٹھیک ہیں، اس کے بعد مولانا حنیف صاحب اور قاری ابوبکر صاحب قاضی سے جو ہمارے اصل وطن کوساڑی سے تعلق رکھتے ہیں ملاقات ہوئی، قاری صاحب نے مولانا ابراہیم میاں کو فون کرکے کہا مولانا حذیفہ صاحب وستانوی آئے ہیں اور آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں، تو انہوں نے دوسرے دن کا وقت دیا، قاری صاحب نے کہا کہ میں تو کل ہندوستان جارہا ہوں، البتہ مولانا حنیف صاحب اور آپ کے برادر سلیم بھائی آپ کو لے چلیں گے، میں '' جزاکم اللہ خیراً'' کے ساتھ ان سے رخصت ہوا۔

''دارالعلوم زکریا'' کا مختصر تعارف:

''دارالعلوم زکریا'' جو ایک چھوٹے سے مدرسہ کی صورت میں آج سے تقریباً ۳۰ر سال قبل شروع ہوا تھا، وہ اب ایک عالمی جامعہ کی صورت اختیار کرگیا ہے، احقر برادر عبداللہ باٹھیا کے شکریہ کے ساتھ مختصر تعارف قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہے:

''دارالعلوم زکریا'' کی ابتدائی تاریخ:

۱۹۸۰ء کی بات ہے کہ حاجی ابوبکر باٹھیا صاحب کے بھتیجے حافظ بشیر صاحب نے ان سے رابطہ کیا اور درخواست کی کہ اعلیٰ اسلامی تعلیمات کے لیے اور کسی دار العلوم کے قیام کے لیے زمین تلاش کی جائے۔ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحبؒ نے ساؤتھ افریقہ کے اپنے ایک سفر کے دوران انہیں ۵ر رینڈ کا سکہ عنایت فرمایا تھا، اس نیت کے ساتھ کہ اسے کسی دارالعلوم کے قیام کے لیے استعمال کیا جائے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے ۱۹۸۱ء میں پہلی بار ساؤتھ افریقہ کا سفر کیا، حضرت مولانا پانڈور کی رہائش گاہ ''ریڈفونٹین'' میں قیام پذیر تھے اور انہیں زامبیا میں واقع 'لوساکا' جانا تھا، وائٹ رِور کے مولانا محمد گارڈی صاحب کی طرف سے نجی طیارہ کو خراب موسم کی وجہ سے اس دن مؤخر کردیا گیا، شیخ زکریا صاحبؒ اپنے کمرے میں گہرے مراقبے میں مشغول تشریف فرما تھے، تبھی محترم مولانا یوسف تتلا صاحب،

حاجی ابوبکر صاحب کو شیخ صاحب کے کمرے میں لے گئے اور انہیں ان کی اس نیت پر مطلع کیا کہ وہ ایک دارالعلوم قائم کرنا چاہتے ہیں اور شیخ زکریا صاحب سے اس سلسلے میں دعا کی درخواست کی، شیخ صاحب نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور دارالعلوم کے قیام کے لیے دعا فرمائی۔

حاجی ابوبکر صاحب نے فوراً مناسب زمین کی تلاش شروع کردی؛ کچھ مہینوں بعد ''لینیشیا'' کے مضافات میں ۲۵ر ایکڑ کا ایک پلاٹ ملا، جو مسز ہیرس نامی خاتون کا تھا، اس جگہ پر ایک مکان، گیرج اور دو عمارتیں تھیں؛ حاجی محمد دھورات صاحب اور حاجی ابوبکر صاحب نے قاری عبدالحمید صاحبؒ سے دوبارہ رابطہ کیا اور زمین خرید کر ایک دارالعلوم کے قیام کی تجویز رکھی؛ حاجی محمد دھورات صاحب نے خود معاہدے کے کاغذات لکھے اور اسے قانونی بنانے کے لیے دس رینڈ جمع کیے، بعد میں حاجی ابوبکر صاحب نے ۴ر اگست ۱۹۸۳ء کو ۲۳۵۰۰۰ر رینڈ میں وہ جائداد خرید لی، جن لوگوں نے سب سے پہلے مجوزہ دارالعلوم کی جگہ کی زیارت کی اور اپنی دعاؤں سے نوازا ان کے نام یہ ہیں: قاری عبدالحمید صاحب، بھائی موٹا، حاجی عبد الصمد چوہان صاحب، باجی پٹیل، حافظ عبدالحمید صاحب چونارا اور صادق بھائی بسم اللہ۔

قاری عبدالحمیدؒ دھودھات صاحب (جو ہمارے متحرک اور فعال ناظم مطبخ حافظ عبدالصمد دھودھات کے عم محترم ہوتے ہیں) کرٹ اسٹریٹ مسجد سے اپنے ۹ طلبا کے ساتھ دسمبر ۱۹۸۳ء میں دارالعلوم منتقل ہوگئے اور تدریس کا سلسلہ شروع

کردیا، اس وقت کوئی باورچی نہ تھا، اس لیے باٹھیا فیملی کی عورتیں روزانہ کھانا پکاتی تھیں اور طلبا کے لیے کھانا بھیجتی تھیں۔ ابتداءً حاجی ابوبکر صاحب کے پٹرول پمپ کی آمدنی مدرسے کے لیے استعمال کی جاتی تھی، جوں جوں مدرسے نے ترقی کی اور اس کی ضرورتیں بڑھیں، حاجی ابوبکر صاحب نے عمارت کی ضرورت پر دھیان دیا اور ایک عمارت تعمیر کی جس میں درس گاہیں، طلبا کی رہائش، نماز کے لیے عبادت خانہ اور حفظ کی درس گاہیں تھیں، رہائشی سہولیات کی کمی کی وجہ سے کچھ اساتذہ طلبا کو پڑھانے کے لیے روزانہ ’’لینشیا‘‘ سے سفر کرتے تھے، بعد میں مرحومہ مریم موسیٰ اور دوسرے مخیّرین نے عمارت کی تعمیر اور پانی کے کنویں کے لیے تعاون کیا، جو تا حال استعمال میں ہیں، مختلف نامعلوم معاونین نے بھی مختلف منصوبوں میں تعاون کیا۔

سب سے پہلے حاجی عبدالصمد چوہان صاحب نے مدرسے کے ٹرسٹ کے دستاویز تیار کیے، یہ بنیادی طور پر ’’مظاہر علوم سہارن پور‘‘ اور ’’تاج المساجد بھوپال‘‘ کے اصولوں پر مبنی تھا اور جسے مقامی وکیلوں کی مدد سے مقامی حالات کے مناسب ڈھال لیا گیا۔ مدرسے کے سب سے پہلے پرنسپل کے طور پر قاری عبدالحمید صاحبؒ نے خدمت انجام دی، جب کہ حافظ بشیر، حاجی ابوبکر صاحب، مفتی اسماعیل صاحب، باجی پٹیل اور مولانا شبیر احمد سالاجی صاحب پہلے ٹرسٹی کے طور پر منتخب کیے گئے؛ ابتداءً قاری صاحبؒ کی نگاہوں نے زیادہ سے زیادہ ۱۲۰؍طلبا کو دیکھا، بہرحال ۳۲؍سالوں بعد، آج بحمداللہ مدرسے میں دنیا کے تقریباً ۵۰؍ممالک سے ۵۰۷؍طلبا موجود ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کی کوشش کو قبول فرمائے اور اللہ تعالیٰ اس دارالعلوم کو ترقیات سے نوازے۔ آمین

(مترجم از انگریزی مولانا شمس الہدیٰ صاحب استاد شعبۂ دعوۃ انگلش)

حافظ بشیر باٹھیا حفظہ اللہ جوسرپرست ہیں اور قاری ایوب اسحاق صاحب اور مولانا محمد ڈڈھالوی وغیرہ سے ملاقات ہوئی، دوسرے سفر میں ناکارہ نے ’’دارالعلوم زکریا‘‘ کی مسجد میں طلبہ سے بعد عشا خطاب بھی کیا، جس میں طلب علم کی اہمیت اور علم کے خاطر اسلاف کی قربانیوں کا تذکرہ کیا اور صالحیت وصلاحیت دونوں پر خاص توجہ دینے کی تلقین کی، جس میں مولانا حنیف صاحب جی بھائی، قاری ابوبکر قاضی، قاری اقبال قاضی وغیرہ بھی ساتھ تھے، اللہ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

مولانا شبیر سالوجی جو اس وقت مہتمم ہیں، دوسرے سفر کے موقع پر ان سے ملاقات نہ ہوسکی، وہ کسی سفر پر تھے۔

’’دارالعلوم زکریا‘‘ ماشاء اللہ علمی میدان میں بھی آئے دن کافی وافی ترقی کررہا ہے ’’فتاویٰ دارالعلوم زکریا‘‘ سات جلدوں میں طبع ہوچکی ہے، اس کے علاوہ ’’**خطبات الأحكام لجمعات العام**‘‘ جدید اسلوب میں تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی، ’’قرار دل‘‘، اسی طرح ’’**الفتاوی السراجیه**‘‘، ’’ذکر اجتماعی وجہری شریعت کے آئینہ میں‘‘، ’’**سبيل الخيرات في جماعة المنقبات**‘‘ دارالعلوم سے شائع ہوچکی ہیں؛ اللہ دارالعلوم کو خوب خوب ترقیات سے نوازے، شرور وفتن سے محفوظ رکھے اور علمائے ربانیین کے وجود میں آنے کا ذریعہ بنائے۔ آمین!

’’میاں فارم‘‘ کی زیارت :

دوسرے دن ہم مولانا ابراہیم میاںؔ صاحب دامت برکاتہم سے شرف لقا کے لیے ان کے دفتر پہنچے، راستہ میں ہمارے ساتھ مولانا حنیف صاحب جی بھائی بھی شامل ہوگئے، مولانا ابراہیم میاں صاحب سے پہلے سے شناسائی تھی، موصوف تقریباً تین سال قبل جب ہندوستان تشریف لائے تھے، تو جامعہ اکل کوا کی زیارت کے لیے والدصاحب کی دعوت پر تشریف لائے تھے، موصوف بڑے باذوق اور علمی فکر کے حامل ہیں، میں نے موصوف کی تشریف آوری کے موقع پر جب گفتگو کی تو حضرت نے ’خاتم المحققین، محدث عظیم، مدقق وقت، عالم باعمل، امیرالمؤمنین فی الحدیث، مؤرخ بے مثال، امام اللغۃ والفقہ، جامع المعقول والمنقول، بقیۃ السلف عارف باللہ حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نوراللہ مرقدہ کا ذکر کیا تو مولانا نے کہا کہ مجھے ان سے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا شرف حاصل ہے، تو میں نے کہا کہ حضرت الامام رحمہ اللہ نے آپ کا تذکرہ الامام العصر المحدث الکبیر علامہ انور شاہ کشمیری نوراللہ مرقدہ کی مایۂ ناز کتاب ’’ التصريح بما تواتر في نزول المسيح ‘‘ میں ترجمۂ مولف کے ذیل میں ’’ مؤلفاته المطبوعة ‘‘ کے عنوان کے تحت علامہ انور شاہ کشمیری نوراللہ مرقدہ کی ۲۱؍مطبوعہ کتابوں کے نام اور تفصیلات ذکر کرنے کے بعد کیا ہے اور پھر انہیں کتاب کی یہ عبارت لاکر دکھائی:

قلت : (الشيخ عبد الفتاح أبو غده) تخريج حوالا تها وتبويبها وتنسيقها دين ثقيل في عنق أصحاب الشيخ وتلامذته الأفاضل ، لا تبرأ ذمتهم إلا بإنجازه . وكنت اقترحت على مؤسس ’’المجلس العلمي‘‘ رجل الخير والبر المفضال الحاج محمد بن موسىٰ ميان السملكي الأ فريقي- رحمه اللّٰه تعالى- تأليف لجنة من أصحاب الشيخ وتلامذته أبقاهم اللّٰه تعالىٰ ، ليقوموا ـ خاصة ـ بتنسيق هذه التاليقات والحواشي ، فإنه لا يستطيع النهوض بهذا الواجب العظيم أحد غيرهم ، وهم الذين صاحبوا الشيخ ،تلقوا أفكاره، عرفوا مقاصده ، ثم جددت هذا الاقتراح على نجل ذلک المحسن الكريم الأخ الفاضل الشيخ إبراهيم حين تفضل بزيارتي في حلب عقب عودته من الحج إلى بيت اللّٰه هذا العام، فوعد خيرا واستبشرنا خيرا وأعود فأقول : أداء هذا الحق لا يزال ممطولا من تلامذة الشيخ الصدور البدور، وأرجو أن تكون كلمتي هذه وهي موجهة إليهم جميعا ـ دافعا جديدا للقيام ببقاء هذا الدين ـ

(التصريح بما تواتر في نزول المسيح :ص ۳۱)

ترجمہ: علامہ کی کتابوں پر تخریج وتعلیق اور ترتیب وتدوین کا کام علامہ کے تلامذہ اور محبین پر بھاری بھرکم قرض ہے؛ جب تک وہ اسے انجام نہیں دیتے اپنی ذمہ

داری سے سبک دوش نہیں ہوسکتے؛ میں نے مجلس علمی کے مؤسس سرتا پا خیر، شیخ محمد بن موسیٰ میاں سملکی ثم افریقی رحمہ اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ بات رکھی کہ وہ شیخ کی کتابوں پر کام کرنے کے لیے علما کی ایک لجنۃ قائم کریں؛ تاکہ وہ اس کام کو انجام دیں؛ کیوں کہ اس کام کو موصوف کے علاوہ کوئی بحسن وخوبی انجام نہیں دے سکتا؛ شیخ کے کام کو ان کے تلامذہ ہی اچھی طرح سمجھے ہوئے ہیں، اس کے بعد اسی ذمہ داری کو میں نے ان کے نجل محترم بھائی شیخ ابراہیم میاںؔ کے سامنے دہرایا، جب وہ بندے کی ملاقات کے لیے سال رواں حج سے فراغت کے بعد شہر حلبؔ تشریف لائے تھے تو موصوف نے وعدہ کیا؛ مجھے اس سے خوشی ہوئی اور امید بھی جاگی، نیز ایک بار پھر میں ''علامہ کشمیری'' کے اس قرض کی ادائیگی کے لیے فکر مندی کا اعادہ کرتا ہوں، جو مسلسل ٹال مٹول کا شکار ہو رہا ہے، اور میں امید کرتا ہوں کہ میری تحریر علامہ کے متوسلین میں ایک بار پھر نئی امنگ پیدا کرے گی اور وہ اس قرض کو ادا کرنے کے لیے کمر بستہ ہو جائیں گے۔

بہر حال علامہ انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کی تصانیف پر جو کام ہونا چاہیے اب تک نہیں ہوسکا، جو افسوس کا مقام ہے؛ البتہ شیخ عبد الفتاح ابو غدہؒ کے توجہ دلانے پر الحمد للہ! حضرت کی بعض کتابوں کو ''مجلس علمی'' نے ضرور شائع کیا اور کچھ پر ''معہد انور دیوبند'' نے کام کیا اور حضرت کے رسائل کو ''مجموعة رسائل الكشميري'' کے عنوان سے چار جلدوں میں دو ہزار سے زائد صفحات پر

ادارۃ القرآن کراچی نے بھی شائع کیا ہے، جس میں ۱۲؍رسائل شامل ہیں، جو یہ ہیں:

[۱] ......فصل الخطاب في مسالة أم الكتاب.

[۲] ......نيل الفرقدين في مسألة رفع اليدين.

[۳] ...... بسط اليدين لنيل الفرقدين.

[۴] ...... كشف الستر عن مسألة الوتر.

[۵] ......عقيدة الإسلام في حياة عيسىٰ عليه السلام.

[۶] ......إكفار الملحدين في ضروريات الدين.

[۷] ...... تحية الإسلام في حياة عيسىٰ عليه السلام (حاشية على عقيدة الإسلام).

[۸] ...... التصريح بما تواتر في نزول المسيح.

[۹] ......مرقاة الطارم لحدوث العالم.

[۱۰] ......ضرب الخاتم على حدوث العالم.

[۱۱] ...... إيناس باتيان إلياس.

[۱۲] ...... خزائن الأسرار.

مجموعی طور پر حضرت علامہ کے رسائل اور تصانیف کی تعداد شیخ عبد الفتاح ابو غدہؒ کی تحقیق کے مطابق مطبوعہ ۲۱؍اور غیر مطبوعہ ۱۳؍گویا ۳۴؍رہیں؛ جن میں سے صرف ۱۲؍''مجموعة رسائل الكشميري'' میں شامل ہیں؛ گویا مطبوعہ بھی ابھی

پچاس فی صد دست یاب ہیں اور غیر مطبوعہ مکمل ۱۳/شیخ عبد الفتاح نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بل کہ آپ فرماتے ہیں: "ولـه مـذكـرات قيـمة في كثيـر مـن الأبحاث الحديثية"، یعنی اس کے علاوہ بھی بہت سے قیمتی علمی مباحث کے مذکرات خاص طور پر حدیث کے مشکل مباحث پر، مثلاً: 'ذو القرنین، یاجوج ماجوج' وغیرہ پر، کاش! کوئی بیڑا اٹھائے اور حضرت کے علمی ورثے کو منصۂ شہود پر لا کرامت پر احسانِ عظیم کرے، بندے کو خود عرصۂ دراز سے حضرت کا ابن ماجہ پر لکھا گیا حاشیہ تلاشِ بسیار کے بعد بھی نہ مل سکا؛ واقعتاً یہ علمائے دیو بند پر ایک عظیم قرض اور فرض ہے۔ اللہ ہمیں اپنے اس قرض کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

البتہ آپ کے رسائل پر جس انداز میں کام ہونا چاہیے تھا ویسا نہیں ہوا، مگر پھر بھی نہ ہونے سے غنیمت ہے کہ کم از کم علامہ رحمہ اللہ کے علمی رسائل ایک بار شائع تو ہو گئے۔

اللہ "ادارۃ القرآن کراچی" اور "مجلس علمی ڈابھیل" "معہد انور دیو بند" اور ان کے ذمہ داروں کو اجرِ عظیم عطا فرمائے اور حضرت کے بقیہ رسائل و مؤلفات کو شائع کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

بہر حال میں ذکر کر رہا تھا مولانا ابراہیم میاں صاحب سے تعارف، جس کے ذیل میں یہ سب باتیں آ گئیں، یہ بات مسلم ہے کہ مولانا علمی عمیق ذوق کے مالک ہیں، آپ جب جامعہ کی زیارت پر تشریف لائے تھے، اس وقت انہوں نے

جامعہ کی مطبوعات خاص طور پر "المسائل المهمة في ما ابتلت به العامة"، "یعنی وہ اہم مسائل جس میں ابتلاء عام ہے"، اسی طرح "محقق و مدلل جدید مسائل" اور شاہراہ علم کے چند خصوصی شمارے دیکھے، تو مسرت کا اظہار کیا اور ساتھ ساتھ طباعت کے سلسلہ میں چند مفید مشورے بھی دیے تھے، اس کے بعد سے ہم اس پر عمل بھی کر رہے ہیں۔

میرے چچازاد بھائی سلیم یعقوب رندیرا نے کہا کہ ہم کو وقت پر پہنچنا ہوگا، مولانا حنیف جی بھائی نے کہا کہ وہ وقت کے بہت زیادہ پابند ہیں؛ صبح دس بجے کا وقت دیا تھا، الحمد للہ! ہم وقت پر پہنچے۔ مولانا اور مولانا کے صاحبزادے محترم مولانا محمد میاں صاحب انتظار ہی میں تھے، ہمارے پہنچنے پر استقبال کیا اور مولانا کے دفتر میں ہم بیٹھے، مولانا نے ناشتہ منگوالیا اور اس کے بعد 'میاں فارم' کی موجودہ کارکردگی پر گفتگو ہونے لگی، تفصیل کے ساتھ مولانا نے بتایا کہ ہم صرف جنوبی افریقہ ہی میں کام نہیں کر رہے ہیں؛ بل کہ اس کے اطراف و اکناف کے دیگر تقریباً دس ملکوں میں کام کر رہے ہیں، ۲۶۰۰ سے زائد مکاتب مختلف افریقی ملکوں میں "میاں فارم" کے زیر نگرانی الحمد للہ! جاری ہے، خاص طور پر مکاتب کا نظام مولانا کے یہاں انتہائی درجہ منظم اور مرتب ہے۔ "میاں فارم" کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سیاہ فام افراد کو محنت کا مرکز بنائے ہوئے ہے، خود وہاں جو ادارہ چل رہا ہے، اس میں بھی تمام طلبہ سیاہ فام ہیں؛ تقریباً تین گھنٹے تک مولانا سے مختلف موضوعات پر گفت و شنید ہوتی رہی، مولانا نے اپنے قیمتی اوقات میں سے اتنا طویل وقت ناکارہ کو دیا یہ مولانا کی ذرہ نوازی تھی۔

مولانا بہت ہی محبت ،شفقت کے ساتھ پیش آئے ، چلتے وقت ادارے کی زیارت کروائی، صفائی ستھرائی کا بڑا اہتمام پایا، کام بھی بڑا منظّم،ظہر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا،ہم نے مسجد میں نماز ادا کی ،طلبہ کی زیارت ہوئی،تمام طلبہ غالبًا ایک سو سے زائد ہوں گے،سب کے سب سیاہ فام تھے،اس کے بعد مولانا محمد میاں ''**قاعة الطعام**'' کی طرف لے گئے ؛وہاں بھی نظام بڑا منظّم تھا،مولانا محمد میاں صاحب نے کہا کہ آپ تھوڑا کھانا چکھ لیں، میں نے چکھا ماشاءاللہ کھانا کافی عمدہ تھا،مولانا محمد میاں صاحب نے کہا کہ روزانہ طلبہ کے کھانے سے پہلے میں خود اس کھانے کو چکھتا ہوں،اس کے بعد طلبہ کو کھلایا جاتا ہے۔

یہ بڑے اہتمام کی بات ہے؛ آج اداروں میں کہاں ایسا ہوتا ہے؛ میرے والد محترم ہمیشہ فرماتے رہتے ہیں کہ اگر ادارہ میں مسجد اور کھانے کا نظام صحیح تو دوسرے تمام نظام خود بخود درست ہوتے چلے جائیں گے۔

بہر حال مولانا اور مولانا کے صاحبزادۂ محترم نے گاڑی کے پاس آکر ہمیں الوداع کیا اور ہم اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہو چلے۔

''میاں فارم'' ایک تاریخی ادارہ ہے جس نے سب سے پہلے جنوبی افریقہ میں مکتب اور حفظ کا شعبہ شروع کیا؛ بل کہ سب سے پہلے مدرسہ کی بنیاد اور دینی کام کی بنیاد وہیں سے پڑی؛ لہٰذا ''میاں فارم'' کے مختصر احوال پیش خدمت ہیں۔

''میاں فارم'' کے بارے میں مزید تفصیلات نہیں مل سکیں، ہمارے دوست بھائی عبداللہ باٹھیا سے یہ معلومات حاصل ہوئی، اللہ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

اس کے بعد ہم مولانا حنیف صاحب جی بھائی کے گھر گئے ،مولاناؒ والد محترم کے گہرے اور قدیم دوست بھی ہیں، اور ہمارے اصل وطن کوساڑی سے تعلق بھی رکھتے ہیں، میرے ساتھ بھی آپ کی اچھی طرح شناسائی ہے،ہم نے ساتھ بے تکلفانہ کچھ دیر ناشتہ وغیرہ کیے اور فارغ ہو کر وہاں سے رخصت ہوئے۔

اگلے دن مملکتِ سعودی عربیہ سے آئے ہوئے جامعہ کے محسن اور میرے والد محترم کے دوست فرید وسئ والا اور ان کے بھائی اقبال وسئ والا اور اقبال بھائی کے صاحبزادے مصطفیٰ وسئ والا سے ملاقات کرنا طے ہوا، اور یہ طے ہوا کہ جمعیۃ علما ،ریڈیو اسلام وغیرہ؛ اسلامی اداروں کی زیارت کی جائے ؛ لہٰذا عم زاد (بھائی سلیم) کے ساتھ صبح ہم ''روشنی'' سے جوہانسبرگ پہنچے، جو تقریباً ۵۰رکلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، جب وہاں پہنچے تو مولانا ظہیر راگی بھائی ان کے ساتھ تھے، اور مولانا داؤد قاسم ،مولانا ابراہیم بھام ،مولانا سلیمان راوت وغیرہ موجود تھے؛ پہلے ہمارے سامنے پروجیکٹر پر ''جمعیۃ علما'' کا تعارف پیش کیا گیا، جب ''جمعیۃ علما'' کی خدمات کو دیکھا اور سنا تو بندے کا تاثر یہ رہا کہ اس وقت دنیا کی سب سے فعال اور متحرک اور منظّم اور کامیاب اگر کوئی ''جمعیۃ علما'' ہے تو وہ ساؤتھ افریقہ کی جمعیت ہے، جس نے حالاتِ حاضرہ کے مطابق امت کی خدمت کا بیڑا اٹھا رکھا ہے، وہاں کے ماحول کے اعتبار سے علما کو انگریزی زبان سے آراستہ کر کے نوجوانوں اور عورتوں میں بڑے عمدہ پیمانے پر کام ہو رہا ہے۔

دوسرا قابل ذکر سب سے بڑا مدرسہ شاید جنوبی افریقہ میں ’’مدرسہ المعہد العالی الاسلامی‘‘ ہے۔مولانا موسیٰ میاں مال دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ؛مگر سادگی اور عمدہ اوصاف کے حامل تھے ؛کافی عرصہ ہوا ان کا انتقال ہوگیا ، وہ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ کے غالباً درسی ساتھی تھے ؛ان کے والد حاجی موسیٰ میاں صاحب جن کا تعلق ڈابھیل گجرات سے تھا، وہ تقریباً ایک سو پچاس سال قبل جنوبی افریقہ ہجرت کر گئے تھے؛ وہاں انہوں نے تقریباً بغیر پونجی کے اپنی تجارت شروع کی ؛مگر اس دار فانی سے رخصتی کے وقت صاحبِ ثروت لوگوں میں شمار ہوتے تھے، بہر حال جب ان کے لڑکے جوان ہوئے تو انہوں نے ان کو بتلایا کہ وہ اس ملک میں ہجرت کر کے آئے ہیں اور ان کے پاس کوئی پونجی نہ تھی ؛مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں خوب نوازا انہوں نے اپنی خواہش ظاہر کی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے خالی ہاتھ پیش ہونا چاہتے ہیں اور انہوں نے یہ تجویز رکھی کہ ان کے لڑکے ایک قیمت متعین کرنے کے بعد ان کی تجارت کو اپنا لیں اور کمائے ہوئے منافع سے قسطوں میں اس کی ادائیگی کریں، ان کے تمام لڑکوں نے یہ تجویز قبول کر لی اور اپنے والد کی کمپنی کے تمام اثاثوں اور قرضہ جات کو چالیس ہزار پاؤنڈ میں خرید لیا۔

اس طرح یہ پوری رقم حاجی موسیٰ میاں صاحب کے ذریعہ’’ مدرسہ المعہد العالی الاسلامی‘‘ کے قائم کرنے کے لیے استعمال کی گئی، میں نے اس مدرسے کی زیارت کی ہے، یہ ایک منفرد ادارہ ہے۔مولانا محمد موسیٰ میاں جب تک بقیدِ حیات تھے،

مدرسے کی دیکھ ریکھ کرتے تھے ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے لڑکے مولانا ابراہیم میاں صاحب نے انتظامی امور کی ذمے داری اپنے ہاتھوں میں لے لی۔اس مدرسے کے بانی کے اہل خانہ مدرسے کے قریب ہی رہائش پذیر ہیں اور میاں خاندان کے نام سے مشہور ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں مذہبی جوش وجذبے سے نوازا ہے اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیاوی نعمتیں بھی خوب بخشی ہیں، مولانا محمد موسیٰ میاں اور ان کے والد کی قبریں قریب ہی ہیں۔

ادارہ واقعتاً بہت ساری خصوصیات کا حامل ہے، خاص طور پر نظام انتہائی درجہ مرتب اور منظّم ہے، اس کے علاوہ ان کا دائرۂ کار دیگر جنوبی افریقہ کے اداروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ وسیع ہے، خاص طور پر اطراف واکناف کے غریب افریقی ملکوں میں مکاتب کا بڑا وسیع نیٹ ورک ہے، تقریباً ۲۶۰۰ر مکاتب بہت عمدہ انداز میں اس کی نگرانی میں چلتے ہیں اور خاص بات یہ کہ یہ ادارہ سیاہ فام مسلمانوں پر پوری توجہ دیے ہوئے ہے۔عام طور پر افریقہ کے مدارس میں سیاہ فام کم اور دیگر ملکوں کے بنسبت ہندوستانی نژاد طلبہ زیادہ ہیں ؛مگر بچھڑے ہوئے علاقوں میں ان کی خاص توجہ ہے۔مولانا ابراہیم صاحب دامت برکاتہم نے بندہ سے کہا بھی کہ آپ ہمیں مکاتب کے لیے ایسے علما دیں جو مجاہدہ کرنے والے ہوں، ہمیں ایسے علما کی ضرورت ہے ؛مگر مل نہیں پاتے۔’’ماشاء اللہ‘‘ مولانا کے فرزند مولانا محمد میاں صاحب بھی بالکل اپنے والد کے نقشِ قدم پر گویا ان کا بایاں بازو بنے ہوئے ہیں، مولانا کا مزاج بالکل صاف

ستھرا ہے، بات بھی حق ہی کرتے ہیں، گوحق گو ہیں؛ البتہ کام کرنے والوں کی بڑی قدر بھی کرتے ہیں، عمدہ مشورے بھی دیتے ہیں، اللہ نے اتنا صاحب ثروت بنایا ہے؛ مگر طبیعت میں نہ کوئی تفاخر ہے، نہ تجدد، مکمل طور پر اصولِ اسلام کے پابند ہیں، ذرہ برابر بھی اس میں لچک نہیں؛ ورنہ عام طور پر اچھے اچھے افراد کو دیکھا گیا، جب مال ودولت بہ کثرت ہوجاتا ہے اور جنوبی افریقہ جیسا آزادانہ ماحول مل جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ لچک آ ہی جاتی ہے پھر علمی استعداد عمدہ ہوتو مزید فتنہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے؛؛ مگر الحمدللہ! ان تمام چیزوں کے باوجود، کوئی بھی چیز مولانا کے صحیح الفکر، دینی خیالات پر اثر انداز نہیں ہوسکی اور مولانا کے صاحبزادے بھی بالکل گویا والد صاحب کی کاپی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آیندہ بھی ان کی اور ہماری اس پرفتن دور میں مادی، علمی، فکری، روحانی ہر طرح کے فتنہ سے حفاظت فرمائے اپنے دین کی مزید خدمت کی توفیق مرحمت فرمائے اور کامیابی سے ہم کنار فرمائے۔ خدماتِ جلیلہ کو قبول فرمائے اور تمام جائز تمناؤں کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ آمین!

جمعیۃ العلما جنوبی افریقہ:

”جمعیۃ العلما جنوبی افریقہ“ کا قیام ”جمعیۃ العلما ٹرانسوال“ کے نام سے ۱۹۲۳ء میں عمل میں آیا، اور اسے مسلمانوں کی مذہبی ضروریات کی تکمیل کے مقصد سے قائم کیا گیا، الحمدللہ! اس کے قیام کو ۹۲ رسال کا ایک طویل عرصہ بیت چکا ہے، تب سے مسلسل یہ اپنی خدمات کی انجام دہی میں مصروفِ کار ہے۔

وہ اکابر علما جنہوں نے ۱۹۳۰ء کے درمیانی عرصے میں اس تنظیم کو حیاتِ نوبخشی ان کے اسما حسب ذیل ہیں: مولانا محمد میاںؒ، مفتی ابراہیم سنجالویؒ، مولانا محمد ایکھلوایا، مولانا عبدالقدیر صاحب ملک پوریؒ، مولانا موسیٰ نانا، مولانا صالح منگیرا، مولانا سلیمان آنندوی، مولانا اسماعیل یوسف گارڈیؒ، مولانا اسماعیل کاچھوی اور دوسرے اکابر وغیرہ بھی شامل رہے، دوسرے بے شمار علمائے کرام بھی ”جمعیۃ علمائے ساؤتھ افریقہ“ کے پلیٹ فارم سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمات انجام دیتے رہے، مثلاً مفتی ابراہیم صاحب سنجالویؒ زندگی کی آخری سانس تک تقریباً چالیس سال تک جمعیۃ کے مفتی کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے۔

☆ بنیادی مقصد:

”جمعیۃ العلما جنوبی افریقہ“ کا مقصد مسلم قیادت، اتحاد واتفاق، مسلمانوں کی ترقی، رہ نمائی اور ان کی نمائندگی ہے۔

☆ مشن:

”جمعیۃ العلما جنوبی افریقہ“ کے قیام کی بنیاد ایک حدیث پر مبنی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علما انبیا کے وارث ہیں (ترمذی) انبیا کی وراثت لوگوں کی بھلائی وخیر خواہی، خوش حالی، مہذب سماج اور پاکیزہ معاشرے کو محیط ہے۔ ”جمعیۃ العلما جنوبی افریقہ“ امت کے لیے روحانی، سماجی ومعاشرتی اور ذہنی تربیت کے لیے ایک مشعلِ راہ ہے۔

جہالت، بدعات واوہام پرستی کی بیڑیوں سے امت کوآزاد کرانا اس کا بنیادی مقصد ہے؛ تاکہ ان کی اسلام کی جانب صحیح رہ نمائی ہوسکے، اس کا مقصد انسانی روحوں میں از سرنو روح پھونکنا ہے اور ان کو تاریکی کی گہرائیوں سے نکال کر نورِ خداوندی کی طرف لانا ہے۔

اس کا مقصد ومشن قرآن کریم کے مذکورہ الفاظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں:

﴿يأمرهم بالمعروف وينههم عن المنكر، ويحل لهم الطيبت ويحرم عليهم الخبائث، ويضع عنهم إصرهم والأغلٰل التي كانت عليهم، فالذين اٰمنوا به، وعزروه ونصروه، واتبعوا النور الذي أنزل معه أولئک هم المفلحون﴾

(سورۃ الأعراف:۱۵۷)

''جمعیۃ العلما'' کا مقصد باطل معبودوں کی غلامی سے امت کوآزاد کرانا اور خداوحدہ لاشریک لہ کی عبادت وبندگی کی طرف دعوت دینا ہے،اسی طرح ظلم وزیادتی، ناانصافی اورعدمِ مساوات کی زنجیروں سے انسانیت کوآزاد کرانا اور دنیا کے اس محدود قیدخانے سے نکال کرآخرت کی وسیع وعریض دنیا کی طرف دعوت دینا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ''جمعیۃ العلما جنوبی افریقہ'' کی بنیاد قرآن کریم کی تعلیمات اورآخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث وسنت پر ہے۔

مقاصد:

☆......امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اہل السنۃ والجماعت کے صحیح عقائد واعمال کی تبلیغ واشاعت۔

☆......سنت کی حفاظت وترویج۔

☆......مسلم معاشرے میں بھائی چارہ اور باہمی تعاون کوفروغ دینا اور مذہبی کاموں کو بڑھاوادینا۔

☆......شرعی قوانین کی صحیح تشریح وتوضیح۔

☆......مسلمانوں کے مذھبی حقوق کی حفاظت اوران کی حمایت۔

☆......مذھبی، ثقافتی، تعلیمی، معاشرتی، اقتصادی اورفلاحی کاموں کوفروغ دینا،اسی طرح نوع انسانی کی عمومی فلاح وبہبود کی کوشش کرنا۔

☆......مسلمانوں کے مفادعامہ کی حفاظت۔

☆......امت مسلمہ کے درمیان اسلامی سماج کی تشکیل ونظم ونسق قائم کرنا

☆......مسلمانوں کے انفرادی واجتماعی حقوق کی حفاظت کرنا۔

شعبہ جات:

''جمعیۃ العلما جنوبی افریقہ'' اپنے اغراض ومقاصد کے حصول کے لیے مختلف شعبوں ومحکموں کو بروئے کارلاتی ہے جیسے:

☆......دارالافتا

☆......دعوت وارشاد

☆......اسلامک ہیلپ لائن

☆......شعبہ برائے فلاح و بہبود

☆......شعبہ مُعاشرت (امورنکاح)

☆......مسلم مجلس قضا (تنازعات کا حل)

☆......مرکزی روٴیت ہلال کمیٹی (روٴیتِ ہلال اور اسلامی مہینوں کی تعیین)

شعبۂ ذرائع ابلاغ (مسلم مسائل ومفاد کی ترجمانی اور رابطۂ عامہ)

ڈھانچہ:

فی الحال ۹۰۰ سے زائد علما وحفاظ ''جمعیۃ العلما جنوبی افریقہ'' کے ممبر ہیں اور ''مجلس العلما'' کو تین مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

(۱) مجلس شوری (۲) مجلس تنفیذی (۳) مجلس عاملہ

ملحقات:

''جمعیۃ العلما جنوبی افریقہ'' حسب ذیل اداروں سے ملحق ہے:

☆......متحدہ علما کونسل برائے جنوبی افریقہ (UUCSA)

☆......ساؤتھ افریکن نیشنل حلال آتھوریٹی (SANHA)

☆......مجلس قومی مذہبی لیڈران۔

☆......علما کانفرنس برائے جنوبی افریقہ۔

جمعیۃ علما کے تاریخی کارنامے:

''جمعیۃ العلما افریقہ'' نے مسلمانوں کی مجموعی اسلامی ضروریات بالخصوص تعلیم پر توجہ دی اور اسلامی تعلیم کے لیے ایک مفید نصاب مرتب کیا، جس کو مزید موٴثر بنانے کے لیے قاری محمد طیب صاحبؒ (مہتمم دار العلوم دیوبند) کی سرپرستی میں ۱۹۶۱ء میں ایک سیمینار کا انعقاد کیا، جس میں علاقے کے تمام مدارس کی تعلیمی ترقی کے لیے ایک متحدہ نصاب تعلیم کی تجویز منظور کی گئی۔ فی الحال ''جمعیۃ علما افریقہ'' کے ممبران نے اسلامی اسکولوں کے قیام اور جمعیۃ کے نصاب کو ان اسکولوں میں موٴثر انداز میں نافذ کرنے کے تئیں اہم رول ادا کیا ہے۔ ۱۹۲۷ء کے آغاز ہی میں ''جمعیۃ علمائے ساؤتھ افریقہ'' نے اپنی پہلی کتاب شائع کی، جس میں شافعی طلبہ اور دیگر بڑی عمر کے لوگوں کے لیے نماز کے بنیادی مسائل کی مکمل رہ نمائی کی گئی تھی، بعد ازاں ۱۹۳۸ء میں ''نصب الرایہ'' اور ''فیض الباری'' کی اشاعت عمل میں آئی، ان کتابوں کو تعلیمی حلقوں میں بین الاقوامی قبولیت حاصل ہے۔ ۱۹۵۰ء کے اواخر میں جمعیۃ نے مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کی فقہ پر مبنی کتاب ''تعلیم الاسلام'' کا ترجمہ کرایا اور اسے ملحقہ مدارس میں نصاب کا حصہ بنایا۔ اسی طرح جمعیۃ نے مسلمانوں کے مفاد عامہ اور ان کی اصلاح کے لیے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا۔

۱۹۵۰ء میں جمعیۃ نے ''گروپ ایریا ایکٹ'' کے خلاف آواز اٹھائی اور مساجد ومدارس کو ظالم حکومت سے بچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تعلیمی خدمات کے علاوہ مسلم مسائل پر حکومت سے گفت وشنید، مسلم پرسنل لا کی حفاظت، حلال وحرام کی نگرانی بھی ''جمعیۃ العلما جنوبی افریقہ'' کی اہم ذمہ داری ہے۔

۱۹۶۰ء کے اواخر میں روٗیت ہلال کمیٹی کی تشکیل دی، رمضان کی ابتدا اور عیدین کی تعیین جیسے اہم اعلانات ریڈیو کے ذریعے شروع کیے گئے۔

۱۹۷۰ء کے نصف میں ''دی میسیج'' نامی فلم میں صحابۂ کرامؓ کی تصویر کشی کی گئی اور دنیا کے مختلف علاقوں میں اس فلم پر پابندی کے باوجود اسے جنوبی افریقہ میں شائع کیا گیا، ''جمعیۃ العلما'' نے اس معاملے کو فلمی بورڈ کے سامنے اٹھایا اور دو ہفتوں کی شنوائی کے بعد اس فلم پر پابندی عائد کردی گئی، جمعیۃ کی جانب سے دو جید علما کو زمبابوے بھیجا گیا، انھوں نے وہاں کے مسلمانوں کا تعاون کیا، اور وہاں بھی فلم پر پابندی عائد کرنے میں جمعیۃ کامیاب ہوگئی، جوں جوں مسلم معاشرے کی ضرورتوں میں اضافہ ہوا، ''جمعیۃ العلما جنوبی افریقہ'' نے اس چیلنج کو قبول کیا۔

۱۹۸۰ء میں پیش آنے والے بدنام زمانہ قادیانی مقدمے میں مسلم عدالتی مجلس کے ساتھ ''جمعیۃ العلما جنوبی افریقہ'' کا قائدانہ کردار قابل ذکر ہے۔

۱۹۸۰ء کے اواخر میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر جمعیۃ کو مزید شاخوں اور نمائندوں کی ضرورت پڑی اور ایک مرکزی دفتر سے تمام مسلمانوں کی خدمت تقریباً ناممکن ہوگئی، اس وقت مختلف شاخیں وجود میں آئیں اور آج جمعیۃ کی سات شاخیں اور چھ علاقائی نمائندے ہیں۔ الحمدللہ!

۱۹۸۹ء میں '' جمعیۃ العلما جنوبی افریقہ'' نے اپنا ایک سہ ماہی پرچہ بھی ''الرشید'' کے نام سے جاری کیا۔

77

۱۹۹۰ء میں ''جمعیۃ العلما جنوبی افریقہ'' توسیع، تنوع اور زبردست تبدیل کے ایک نئے دور میں داخل ہوئی اور ۱۹۹۲ء میں ''جمعیۃ علما جنوبی افریقہ'' نے امت مسلمہ میں مشاورتی خدمات کی فراہمی کی ضرورت محسوس کی اور اس کے لیے اسلامی کیئر لائن کی تاسیس عمل میں آئی۔

۱۹۹۴ء میں ''جمعیۃ العلما جنوبی افریقہ'' میں مسلم قومی مسائل کی نمائندگی کے مقصد سے متحدہ علما کونسل کی تشکیل میں پیش پیش رہی، سات اراکین پر مشتمل اس سال ''متحدہ علما کونسل'' کی زیر قیادت علما کے ایک اعلیٰ وفد نے سابق صدر نیلسن منڈیلا سے ملاقات کی، جنہوں نے ذاتی طور پر اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ ان کی حکومت مسلمانوں کی شادیوں کی منظوری کے حوالے سے پیش آنے والی تمام دشواریوں کے ازالے کو یقینی بنائے گی۔

''جمعیۃ علمائے افریقہ'' نے بہت سارے میمورنڈم، جو جنوبی افریقہ کی حکومت کو پیش کئے، ان میں فحاشی، اسقاط حمل، سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم کی منظوری، سنگین سزائیں اور دوسرے بہت سارے ضروری مسائل شامل تھے، دعوت کے عمل کو عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے ''جمعیۃ العلما افریقہ'' نے جو عزم کیا تھا، وہ ریڈیو اسلام کی تشکیل کی شکل میں ۱۹۹۳ء میں منظر عام پر آیا اور اپریل ۱۹۹۷ء میں اسے باقاعدہ منظوری ملی، اور اس کا پہلا سگنل براڈ کاسٹ ۱۱/اپریل ۱۹۹۷ء کو ہوا، ریڈیو اسلام کے سامعین کی ایک بڑی تعداد ہے، جس کے پروگرام نوجوان اور بوڑھوں دونوں کے لیے یکساں طور پر دلچسپ ہوتے ہیں، الحاصل! ریڈیو اسلام بہت ساری فیملی کے لیے اسلامی تعلیمات کے حصول کا آسان ذریعہ بن چکا ہے۔

اسی طرح ''جمعیۃ العلما جنوبی افریقہ'' کی مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں ۲۰ر اکتوبر ۱۹۹۶ء کو جنوبی افریقہ کی ''قومی حلال اتھوریٹی'' کا قیام عمل میں آیا، جس کی مجلس تنفیذی میں ''جمعیۃ العلما ساؤتھ افریقہ'' ایک اہم رکن کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔

''جمعیۃ العلما'' کے کاموں کو وسیع پیمانے پر مزید مؤثر انداز میں انجام دینے کے لیے جمعیۃ کی توسیع کے مدنظر ۲۰۰۱ء میں اس کی مرکزی آفس ''بیت الحمد''، ۳۲ ڈولی فورڈ برگ میں منتقل کی گئی، تب سے جمعیۃ کے ممبران میں جہاں اضافہ ہوا وہیں ہر سال جمعیۃ کے سالانہ اجلاس میں ۳۰۰ر ممبران کی شرکت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

''جمعیۃ العلما جنوبی افریقہ'' نے اسی دوران ایک اسلامی ادارے کے قیام کی شدید ضرورت محسوس کی، جس کے لیے وقت کے اکابر علما جیسے مفتی نظام الدینؒ اور مولانا عبد اللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم سے رابطہ ومشورے کے بعد ۲۰۰۵ء میں ''جامعۃ العلوم الاسلامیہ'' کے نام سے ایک اہم عربی اسلامی تعلیم کے مرکز کا قیام عمل میں آیا، جس کا مقصد معیاری اور ایسے ماہر علما کی کھیپ تیار کرنا ہے، جو ترقی یافتہ موجودہ دنیا میں پیش آنے والی نت نئی تبدیلیوں اور چیلنجز کا سامنا کر سکیں اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں صحیح رہنمائی کر سکیں، ''جمعیۃ العلما ساؤتھ افریقہ'' کے قیام کو ۹۲ر سال گزر چکے ہیں اور اس تنظیم نے زندگی کے مختلف میدانوں میں اسلامی تہذیب سے دور ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی بروقت بھرپور خدمت انجام دی جو دیگر ممالک اور تنظیموں کے لیے مشعل راہ بھی ہے اور حوصلہ افزا اقدم بھی۔

''جمعیۃ علما'' کی تاریخ اور کارکردگی دراصل سال گزشتہ کے طویل سالانہ انگریزی رپورٹ میں تھی، جس کا جامعہ کے ''شعبۂ انگلش'' کے موقر استاذ مولانا شمس الہدیٰ صاحب نے تلخیص کے ساتھ ترجمہ کیا۔ **فجزاهم الله خيرا في الدارين!**

بندہ پہلی بار جنوبی افریقہ پہنچا اور وہاں کے ذمہ داروں نے تفصیل کے ساتھ ان کی کارکردگی بندہ کے سامنے رکھی، بل کہ مشاہدہ کروایا، اس ذرہ نوازی پر بندہ تمام ذمہ داروں کا خاص طور پر مولانا ظہیر راگی، مولانا داؤد قاسم، مولانا ابراہیم بھامؔ وغیرہ کا مشکور وممنون ہے۔

سابقہ صفحات میں آپ کی خدمت میں ''جمعیۃ علمائے جنوبی افریقہ'' کا تعارف پیش کیا گیا، اب ریڈیو اسلام کا تعارف پیش خدمت ہے:

جیسا کہ بندہ اس سے قبل کہہ چکا ہے کہ جنوبی افریقہ کا پہلا سفر شعبان ۱۴۳۵ھ میں ہوا، اس سفر کے بعد ممبئی میں حاجی عبد القادر فضلانی (سوپاری والا) صاحب سے ملاقات ہوئی، دورانِ ملاقات حاجی صاحب کو بندے نے جنوبی افریقہ کے سفر کی روداد سنائی، جس میں خاص طور پر ریڈیو اسلام کا تذکرہ کیا، اور کہا کہ ''ریڈیو اسلام'' وہاں پر مسلمانوں میں دینی بیداری کے سلسلہ میں بڑا اہم رول ادا کر رہا ہے، ہمیں بھی ہندوستان میں اس کے بارے میں سوچنا چاہیے تو حاجی صاحب نے فوراً کہا کہ اس بارے میں ممکن کوشش کیجیے، ان شاء اللہ میں تعاون کروں گا۔ اللہ حاجی صاحب کو جزائے خیر سے نوازے، آپ نے کہا کہ ''بیٹا حذیفہ آپ ایک اچھی ٹیم لے کر

وہاں جاؤ اور اس کے نظام کو سمجھو کہ ہندوستان میں ہم اس سلسلہ میں کیا کر سکتے ہیں؟
اس کا جائزہ لو' میں نے کہا ٹھیک ہے، ان شاء اللہ میں جلد از جلد ترتیب بناتا ہوں، یہ
وعدہ کیا اور آ گیا۔

قبل اس کے کہ ریڈیو اسلام کا تفصیلی ذکر آئے، ساؤتھ افریقہ کے پہلے سفر کا
تذکرہ جو کچھ رہ گیا ہے اسے پورا کرنا چاہوں گا، گذشتہ صفحات میں پیٹر میرز برگ،
ڈربن، کرانس کوپ، گرے ٹاؤن وغیرہ کے تذکرہ کا وعدہ کیا تھا، اسی کڑی کو اب آگے
بڑھاتا ہوں۔

چچازاد بھائی کے ساتھ سلیم یعقوب رندیرا پیٹر میرز برگ نور محمد حبیب کے
یہاں جانا ہوا، جن کا وہاں گاڑیوں کا بڑا کاروبار ہے، انہوں نے پر تکلف دعوت کی، اس
کے بعد ہم اپنے چچازاد بھائی سلیم یعقوب رندیرا کے ساتھ ڈربن کے لیے چل دیے
، وہاں جمعہ کے دن پہنچے، جمعہ کی نماز سے کچھ دیر قبل ڈربن کے تبلیغی جماعت کے مرکز پر
جمعہ کی نماز کے لیے پہنچے، جہاں انگریزی میں بیان ہو رہا تھا تو آئیے اسی مناسبت سے
جنوبی افریقہ میں دعوت وتبلیغ کے کام اور تاریخ یہاں پر ذکر کرتے چلتے ہیں:

جنوبی افریقہ میں دعوت وتبلیغ کی کوششوں کی مختصر ابتدائی تاریخ:

گجرات کے حافظ سوجی رحمۃ اللہ علیہ نے روڈ ریپورٹ کے جوہنسبرگ کے
نواحی علاقے میں دعوت وتبلیغ کی کوشش کے روح رواں اور بانی حضرت مولانا الیاس
دہلوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کے صرف تین دہائیوں کے بعد ۱۹۵۰ء کی دہائی

میں پہلی بار باضابطہ طور پر بارگشت کا آغاز اس وقت کیا جب آپ اپنے خاندان کے
ہمراہ جنوبی افریقہ کے دورے پر تھے۔

البتہ باقاعدہ جنوبی افریقہ میں دعوت وتبلیغ کی کوششوں کے اولین روح
رواں حاجی بھائی پاڈیہ ہیں۔جن کا پورا نام جناب غلام محمد اسماعیل پاڈیہ رحمہ اللہ تھے،
آپ کی پیدائش ۱۹۵۳ء میں جنوبی افریقہ کی ریاست نٹال کے شہر امزنٹو میں ہوئی،
حاجی بھائی پاڈیہ اپنے عنفوان شباب ہی سے دین کی طرف رغبت ومیلان کی وجہ سے
تقوے کی صفات جیسے نماز وتلاوت قرآن شریف کے بے حد پابند تھے۔

حاجی صاحبؒ ۱۹۶۱ء کے آس پاس اپنی اہلیہ محترمہ اور دیگر اہل خانہ کے
ہمراہ حج کے لئے روانہ ہوئے، جہاں پہلی بار تبلیغ کے کام سے آشنا ہوئے، اور حرم
شریف میں حضرت مولانا عمر پالن پوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بیان سننے کے
بعد خانۂ کعبہ کی طرف متوجہ ہو کر اللہ تعالی سے قبولیت کی دعا کی، اور فوراً ہی نقد چار ماہ
فی سبیل اللہ نکلنے کے لیے حرم شریف سے نئی دہلی، انڈیا کے لیے روانہ ہو گئے، جہاں
آپ کی ملاقات حضرت مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ سے ہوئی۔

جنوبی افریقہ واپسی پر تبلیغ کی کوششوں کے آغاز کا سہرا آپ ہی سر بندھا،
چناں چہ آپ نے سب سے پہلے اپنے خاندان اور رشتہ داروں پر اپنی کوششوں کا آغاز
کیا جس کے نتیجے میں آپ کی کوشش اور دعا کی برکت سے بہت سے رشتہ داروں نے
اپنے بچوں کو حافظ اور عالم بننے کے لیے میاس فارم بھیجنے لگے۔

نیٹل میں کوشش کی شروعات:

مولا یونس پٹیل نے (جواس وقت ایک نو جوان لڑکے تھے) نے مندرجہ ذیل واقعہ اس طرح بیان کیا ہے، "ایک دن ۱۹۲۶ء میں جب حاجی بھائی نے تبلیغ کی اپنی کوششیں شروع ہی کی تھیں، تو (اے کے سلیجی کے ذریعہ) گرے سٹریٹ مسجد کے نوٹس بورڈ پر ایک اعلان لکھا گیا کہ حاجی غلام محمد پاڈیا صاحب خطاب فرمائیں گے۔ آپ نے (اردو زبان میں ہکلاتے اور لڑکھڑاتے ہوئے) خطاب مکمل کرنے کے بعد (انگریزی میں تشکیل کی) مدد کی درخواست کی، لیکن کوئی بھی مدد کے لیے کھڑا نہیں ہوا۔ لہذا حاجی بھائی کے سسر (حاجی ابراہیم دیسائی صاحب) نے میرے ہمراہ (اس وقت میں ایک اے سالہ نو جوان لڑکا تھا) اور ایک اور بزرگ آدمی (حاجی قاسم دیسائی صاحب) نے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کیں (تبلیغ میں نام لکھوایا)۔

ہم ڈربن سے اسکورٹ، وہاں سے لیڈی اسمتھ (نیو کاسل، اسٹنڈرڈ ٹاؤن) اور اس کے آگے جوہنسبرگ تک کا سفر کیا۔ حاجی صاحب نے دین کی اہمیت کے تعلق سے ہر شہر میں لوگوں کی منت وسماجت کی، لیکن کوئی بھی مدد کے لیے تیار نہ ہوا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ سفر کے دوران ہمیشہ حاجی بھائی ہر رات دو گھنٹے تک مسلسل روتے ا (ور اللہ کے حضور گڑگڑاتے)۔ ایک اور موقعہ پر میں نے حاجی بھائی کی رفاقت میں امزنٹو کی مسجد میں اس وقت سونے کا فیصلہ کیا جب آپ تنہا ہی مسجد میں

80

سونے جارہے تھے، میں نے دیکھا کہ حاجی بھائی کئی گھنٹے تک تہجد میں اللہ رب العزت کے سامنے روتے اور گڑگڑاتے رہے۔

شہر ریچ مونڈ کے مولانا محمود مدنی ؒ کے والد محترم حاجی احمد دیسائی رحمہ اللہ حاجی صاحب کو امزنٹو سے اپنے ہمراہ لیتے اور مختلف جگہوں کا سفر کرتے ہوئے دین کی محنت کرتے۔ حاجی سید ابراہیم فخر الدین ؒ اور آپ کی اہلیہ محترمہ بھی کار تبلیغ میں حاجی صاحب کے اولین معاونین میں سے تھے۔ آپ بھی حاجی صاحب اور آپ کے قریبی دوست حاجی ابوبکر صاحب کے ساتھ بکثرت تبلیغی اسفار کرتے، یہ تینوں احباب روزآنہ جماعتوں کو باہر بھیجنے اور ان کی مدد کرنے کے لیے مشورے کرتے، نیز بیماروں کی مزاج پرسی کرتے اور جنازوں میں شریک ہوتے۔

اسپنگو بیچ کا سلیجی خاندان ہی وہ کنبہ ہے جس نے حاجی صاحب کا ازحد بخوشی وبرضا ورغبت تعاون کیا، اس کنبے نے نہ صرف حاجی صاحب اور آپ کی فیملی کے تمام اخراجات کی ذمہ داری لی بلکہ انہیں اسپنگو بیچ پر آباد بھی کیا تاکہ حاجی صاحب شہر اور مسلمانوں کی اکثریت سے قریب رہیں۔

ہفتہ واری شب گزاری پروگرام مختلف مساجد میں سنیچر کی عصر سے اتوار کی ظہر تک منعقد ہوتا تھا اور ہفتہ واری مشورہ شروع میں ویسٹ اسٹریٹ کی مسجد میں ہوتا تھا لیکن بعد میں جنکشن مسجد میں منتقل کر دیا گیا، البتہ فی الحال دونوں پرگرام اور پورٹ کی مسجد ہلال میں ہوتے ہیں۔

کیپ ٹاؤن میں کوشش کی شروعات:

ڈربن سے واپسی کے چند دنوں بعد حاجی صاحب اور آپ کے رفقاء نے لوگوں سے ملنے اور انہیں تبلیغ کی محنت سے روشناس کرانے کی غرض سیمشرقی لندن، پورٹ الزبیتھ اور کیپ ٹاؤن کا سفر بس، ٹرین، ٹکسی، لفٹ یا کسی اور دست یاب سواری کے ذریعے کیا۔ آپ حضرات نیمیو را سٹریٹ کی مسجد میں چند دن قیام کیا، قیام کے دوران حاجی صاحبؒ اس علاقے کے چند مسلم بدمعاشوں کے پاس بنفس نفیس تشریف لے گئے اور ملاقات کی۔ بعد میں یہی برادران کیپ ٹاؤن میں دعوت کے مبارک کام کے قیام کے لیے بنیاد کا پتھر ثابت ہوئے اور کیپ ٹاؤن میں میور اسٹریٹ کی مسجد دعوت وتبلیغ کا مرکز بن گئی۔

ٹرانسوال میں کوشش کی شروعات:

حاجی صاحبؒ نے ٹرانسوال کا کئی سفر کیا، پانولی انڈیا کے مرحوم قاری عبد الحمید دھودھات (رحمۃ اللہ علیہ) سابق امام کرک اسٹریٹ مسجد، جوہنسبرگ نے حاجی صاحبؒ کی تبلیغ کی محنت اور کوشش میں پوری مستعدی کے ساتھ مدد کی، (جس کی وجہ سے) کرک اسٹریٹ کی یہ مسجد جنوبی افریقہ کے دوسرے بہت سے شہروں کے لیے امید اور روشنی کا مینار ثابت ہوئی، (یہ بات قابل ذکر ہے کہ) اس وقت یہی وہ واحد مسجد تھی جو دوسری جگہوں سے آنے والی جماعتوں کی میزبانی کرتی، ہر بدھ کو

جماعت کے ساتھی ملتے اور یہ مشورہ کرتے کہ کیسے اور کہاں اگلی کوشش ومحنت صرف کی جائے، (بہرکیف) جلد ہی یہ مسجد دینی سرگرمیوں کے لیےمرکز کی شکل اختیار کرگئی۔ ہفتہ واری شب گزاری (ہفتہ واری مذہبی اجتماع) پروگرام کا انعقاد سب سے پہلے یہیں ہوا، جس کے بعد کرک اسٹریٹ کی یہ مسجد ٹرانسوال میں دعوت وتبلیغ کا مرکز بن گئی۔ فی الحال تبلیغی مرکز کراؤن مائنس، جوہنسبرگ میں نور مسجد میں واقع ہے۔

پہلا اجتماع/ جوڑ:

پہلا اجتماع ۱۹۶۶ء میں نیٹل میں لیڈی اسمتھ کے قریب ایک شہر ڈینڈی میں منعقد ہوا، اس اجتماع میں جماعت کے اکابرین میں سے حضرت مولانا عمر پالن پوریؒ، مفتی زین العابدینؒ، مولانا موسی سمرودیؒ اور دوسرے بہت سارے علماء واکابر نے شرکت کی۔ اس اجتماع میں حاضرین کی مجموعی تعداد تقریبا ۵۰۰ تھی۔

بیرون ملک جانے والی پہلی جماعت:

جنوبی افریقہ سے سب سے پہلی جماعت دو علماء مولانا موسی تیمولؒ اور مولانا عبدالحق عمرجی کے ساتھ ۱۹۶۶ء میں بذریعہ بحری جہاز موریشس اور ری یونین گئی۔ امیر جماعت حضرت مولانا عمرجی تھے۔

افریقہ میں پہلی بار ایک چارٹرڈ فلائٹ ایک جماعت کو اسی سال زامبیا لے گئی۔

ویسٹ انڈیز جانے والی سب سے پہلی جماعت جنوبی افریقہ ہی کی تھی، اور حاجی صاحب بذات خود اس جماعت کو لے گئے تھے، نیز اس کے علاوہ جنوبی افریقہ سے یو ایس ایس آر جانے والی سب سے پہلی جماعت کی قیادت بھی حاجی صاحب ہی نے کی۔

حاجی صاحب کی بے نظیر خصوصیات:

حاجی صاحب کی من جملہ بے نظیر خصوصیات میں سے بعض درج ذیل ہیں:

امت کی بہتری اور خیر خواہی کے لیے فکر اور دل سوزی، امت کے لیے مستقل اشک ریزی، انسانیت سے ہمدردی، علماء سے محبت و احترام، سبھی سے دوستی، اور دینی مقاصد کے لیے اور بھی زیادہ، حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پیروی کے بے حد حریص اور عاشق، سادگی، اعلیٰ اخلاق، امت کے سارے گروہوں کو متحد کرنے کی تگ و دو، امانت کی ادائیگی، سخاوت اور دریا دلی، تواضع و خاک ساری، لایعنی سرگرمیوں اور غیبت وغیرہ سے پرہیز۔

حاجی صاحب کا تعاون اور شراکت:

اسپنگو بیچ میں مدرسہ تعلیم الدین کے لیے زمین کی حصول یابی، سورت میں کم چار راستہ مسجد کی تعمیر، کلیر ووڈ میں قبرستان کی تعمیر نیز بہت ساری مساجد و مدارس کے قیام اور دوسرے بہت سارے رفاہی کاموں کے فروغ کے تعلق سے حاجی صاحب کا نمایاں کردار تھا۔ چناں چہ آپ نے (ان کاموں کے سلسلے میں) بہت سارے سیاسی کارکنوں جیسے مرحوم احمد کٹراڈا اور فاطمہ میر سے بات چیت بھی کی۔

آپ نے دنیا کے بیشتر حصوں میں غریب اور بے گھر لوگوں کی مدد کی، سیکڑوں غریب لڑکیوں کا مالی تعاون کیا جس سیان کی شادی کے امکانات روشن ہو گئے۔

حاجی صاحب کی کوششوں کی بدولت بیشتر خاندانوں کی زندگیاں اس قدر متاثر ہوئیں کہ انہوں نے اپنے نونہالوں کو عالم بننے کے لیے باہر بھیج دیا، مولانا عبد الحق مکدا، مولانا فاروق بوبت، مولانا یونس پٹیل رحمہ اللہ، مولانا محمود مدنی اور مفتی ابراہیم دیسائی نیز ان کے علاوہ جنوبی افریقہ میں دوسرے بہت سارے علماء آپ ہی کی کوششوں کا ثمرہ ہیں۔

حاجی صاحب ملک کے مدرسوں اور بڑے اداروں کا دورہ کرتے اور وہاں کے طلبہ کو چھٹیوں میں جماعت میں وقت لگانے کے لیے حوصلہ افزائی کرتے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ آپ کی مسلسل کوششوں کی وجہ سے بہت سارے علماء مکمل ایک سال جماعت میں لگا چکے ہیں اور فضیلت کے بعد برابر لگاتے رہتے ہیں۔

خاتمہ:

حاجی صاحب رحمہ اللہ ١٩٩٨ء میں اس دار فانی سے دار البقا کوچ کر گئے، (انا للہ و انا الیہ راجعون)۔ آپ کی نماز جنازہ میں تین ہزار لوگوں نے شرکت کی۔ امت کی

اصلاح اور اتحاد کے لیے دین اسلام کے ساتھ آپ کا تعاون جنوبی افریقہ، ویسٹ انڈیز، فجی، زامبیا، زمبامبوے، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، ریاستہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ،فرانس، پیراگوائے، پناما، برازیل اور روس میں غیر معمولی ہے۔اللہ تبارک و تعالی آپ کو امت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کی جانب سے بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے،آمین۔

درج بالا سطور حاجی بھائی پاڈیہ رحمۃ اللہ علیہ کی حیات پر متعدد مضامین میں ترمیم وتلخیص کے ساتھ پیش خدمت ہیں۔

(۲/ رمضان ۱۴۳۸ھ- ۱۸مئی ۲۰۱۸ءعبداللہ باٹھیا/ دارالعلوم زکریا جنوبی افریقہ)

سفر نامہ کافی عرصہ مکمل ہو چکا تھا والد صاحب کا حکم ہوا کہ دعوت وتبلیغ سے متعلق قدرے تفصیل آجانی چاہیے تو احقر نے بہت کوشش کی مگر جب مواد نہیں مل سکا تو مولانا عبداللہ باٹھیا صاحب سے رابطہ کیا تو موصوف نے انگریزی میں مواد جمع کر کے ارسال کیا،مولانا سلیمان اختر فاروقی استاذ شعبہ انگریزی جامعہ اکل کوا نے اردو میں ترجمہ کردیا،احقر دونوں حضرات کا دل کی گہرائی سے ممنون ومشکور ہے۔

ڈربن میں مقیم ہمارے پھوپھی زاد بھائی سلیمان ایوب پٹیل بھی ساتھ ساتھ تھے،نماز کے بعد کچھ دیر کے لیے ان کے گھر گئے اور اس کے بعد والد صاحب کے دوست پاریکھ فیملی سے جن کا تعلق ہے ان کے پاس گئے؛ انہوں نے بھی اکرام کا معاملہ کیا،ان کے ساتھ ان کے دفتر میں کھانا کھایا،ان کا تیار کپڑوں کا بڑا کاروبار ہے

، والد صاحب کے ساتھ ان کے بہت قدیم اور بہت زیادہ گہرے تعلقات ہیں ، انہوں نے جامعہ کی روداد سنی اور خوشی کا اظہار کیا۔ان کی ملاقات سے فراغت کے بعد یہ طے ہوا کہ ڈربن میں واقع مفتی زبیر صاحب کے'' دارالاحسان'' کی بھی زیارت کرلی جائے ؛ لہٰذا ہم ''دارالاحسان'' پہنچے ، جہاں مفتی زبیر صاحب بھیات پہلے سے موجود تھے ،مفتی صاحب نے پر تپاک استقبال کیا،اور والد صاحب کی خدمات کو سراہا ، ناشتہ سے ضیافت کی ۔اب'' دارالا حسان'' کا تعارف پیش خدمت ہے:

مرکز'' دار الإحسان للخدمات الإسلامية'':

Darul Ihsan Islamic service center

''دارالا حسان'' کی بنیاد ۲۰۰۰ء میں مفتی ظہیر صاحب بھیات مدظلہ العالی کے ہاتھ پڑی ،ادارے کا خاص مقصد معاشرے کو جن مفید خدمات کی ضرورت ہے وہ پیش کرنا؛ البتہ مسلمانوں کو اسلامی دائرے میں رہ کر دینی رہنمائی کرنا اس کا اصل ہدف ہے،اسی لیے دینی خدمات کو اوّلیت حاصل ہے،مثلاً: فقہ وفتاوی، دعوت وتعلیم، نشر واشاعت اور کونسلنگ وغیرہ۔

ادارے کے تمام تر امور کی انجام دہی علما کے ہاتھوں انجام پاتی ہے،جس میں قرآن وحدیث کی تعلیمات کی مکمل پاس داری کی جاتی ہے۔

ادارہ کا مرکزی دفتر جولیس روڈ، سیکا ولیک، ڈربن میں واقع ہے اور دیگر دفاتر ڈربن شہر کے مختلف مقامات پر واقع ہیں، اور ایک دفتر جوہانسبرگ میں بھی موجود ہے۔ ''دارالاحسان'' کی عمدہ خدمات کی وجہ کر عوام وخواص میں اسے مقبولیت حاصل ہے، ادارے نے زمانہ کی ضرورتوں کا پاس ولحاظ کرتے ہوئے امت مسلمہ کی رہنمائی کا بیڑا اٹھایا ہے، جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

میڈیا :

ادارہ کا یہ ایک خاص متحرک اور فعال شعبہ ہے، جس میں علما اور ماہرین کی ایک جماعت انگریزی اخبارات، جرائد اور ویب سائٹ پر اسلام کے خلاف کیے جانے والے پروپیگنڈے کا دنداں شکن جواب بڑی عرق ریزی سے تیار کر کے دیتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ عصرِ حاضر کے پیش آمدہ پیچیدہ مسائل کا حل بھی امت کے سامنے اچھے اور مؤثر اسلوب میں پیش کرتی ہے۔

شعبۂ افتا:

ٹیلی فون، انٹرنیٹ، ای میل، فیکس کے ذریعہ موصول ہونے والے شرعی سوالات کے جوابات دینا اس شعبہ کا کام ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس شعبہ سے امت کو درپیش پیچیدہ مسائل پر تفصیلی مواد تیار کر کے شائع کیا جاتا ہے۔

84

شعبۂ کونسلنگ :

زوجین اور خاندان میں آپسی اختلاف اور تنازعات کو شرعی اصول کی رہنمائی میں حل کرنا اس شعبہ کا فریضۂ منصبی ہے۔

شعبۂ امداد:

یہ شعبہ اہل خیر حضرات کے زکاۃ وصدقات کو جمع کر کے فقرا اور مستحقین تک پہنچاتا ہے، خاص طور پر غریب اور ضرورت مند طلبہ کو امداد فراہم کرتا ہے، ڈربن شہر کے ہزاروں طلبہ اس سے استفادہ کر رہے ہیں، اسی طرح ضرورت مند کسانوں اور تاجروں کو بھی تعاون پہنچایا جاتا ہے۔

امت کے نوجوانوں میں قائدانہ صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش :

مختلف تعلیمی، تربیتی، پروگراموں کے ذریعہ نوجوانوں کی صلاحیت کو اجاگر کیا جاتا ہے، علما کی نگرانی میں عمرہ وغیرہ جیسے روحانی اسفار کروائے جاتے ہیں، اسی طرح یونی ورسیٹیوں، اسکولوں اور مدارس کے طلبہ میں مختلف پروگرام کا انعقاد کروایا جاتا ہے، جس میں سوال وجواب کا بھی وقت دیا جاتا ہے؛ تاکہ طلبہ اپنے مسائل کا حل جان سکیں۔

شعبۂ تعلیم وتربیت:

اس شعبہ کے ذریعہ اسکول کے طلبہ کے لیے حفظ قرآن اور اسلام کے مبادیات کی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے اور طلبہ کے لیے کیریر گائیڈنس کا انتظام ہوتا ہے۔

شعبۂ نشر واشاعت:

مختلف موضوعات پر امت مسلمہ کے درمیان چھوٹے چھوٹے کتابچے اور پمفلٹ تقسیم کیے جاتے ہیں اور مناسب مقامات پر چسپاں کیے جاتے ہیں اور ای میل کے ذریعہ ہزاروں افرادِ امت کو ارسال کیے جاتے ہیں۔

شعبۂ نکاح:

نکاح کی رجسٹری مفت میں کی جاتی ہے۔

شعبۂ محاضرات:

علما کی جماعت مختلف علاقوں میں جا کر مختلف عنوان پر عامۃ المسلمین کے درمیان محاضرات دیتی ہے، کبھی احکام شرعیہ تو کبھی صحابہؓ کے احوال وآثار اور ان کے دفاع وغیرہ وغیرہ۔

شعبۂ خطابت ودعوت:

یہ شعبہ ہر ہفتہ خطبات تیار کرتا ہے اور پھر رجسٹرڈ مساجد، مراکز میں ان کو ارسال کرتا ہے۔

شعبۂ تجدیدِ کتب قدیمہ:

اس شعبہ میں مختلف قدیم کتابی نسخوں کو سلیقہ سے مرتب کیا جاتا ہے اور ضرورت مند علاقوں میں ارسال کیا جاتا ہے۔

شعبۂ روزگار:

جو لوگ بے روزگار ہوتے ہیں، انہیں انٹرنیٹ وغیرہ سے معلومات حاصل کر کے روزگار مہیا کیا جاتا ہے۔

شعبۂ ہدایا وتحائف:

جہاں لوگوں میں غربت کے ساتھ ساتھ، اعمال صالحہ میں بھی دلچسپی نہیں ہوتی؛ وہاں اعمالِ صالحہ کرنے پر مصلے اور کتابوں کی صورت میں تحفے تحائف دیے جاتے ہیں۔

شعبۂ تدریب:

مختلف دورانیہ کے تدریبی پروگرام کے ذریعہ نوجوانوں کو ٹریننگ دی جاتی ہے، مثلاً کمپیوٹر ٹریننگ، موٹر ٹریننگ، اسکوٹر ٹریننگ وغیرہ۔

غرض یہ کہ ”دارالاحسان“ جنوبی افریقہ اور خاص طور پر ڈربن میں متنوع خدمات کی وجہ سے بے حد مقبول ہے، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور مفتی صاحب کی عافیت کے ساتھ عمر دراز فرمائے۔ آمین

ہم مفتی صاحب سے رخصت ہو کر کرانس کوپ کے لیے روانہ ہو گئے، چچازاد بھائی سلیم جو مستقل سفر میں ساتھ رہے، انہی کی گاڑی میں ہم آگے نکلے، اب یہاں سے ہمارے دوسرے پھوپھی زاد بھائی اقبال بھی ساتھ ہو گئے۔ کرانس کوپ جو ڈربن سے تقریباً دو یا تین گھنٹے کی مسافت پر ہے اور گریٹا وَن سے ۲۵ رکیلومیٹر پر

واقع ہے؛ جہاں ہمارے وطنِ اصلی کوساڑی کی تقریباً چالیس سے زیادہ فیملیاں آباد ہیں۔ کچھ لوگوں کا اپنا کاروبار ہے اور کچھ لوگ ملازمت کرتے ہیں، اس کے اطراف واکناف میں بھی بڑی تعداد میں ہمارے گاؤں کے افراد آباد ہیں۔

کوساڑی کی تاریخ:

''کوساڑی''، ضلع سورت گجرات کا ایک تاریخی ومسلم اکثریتی قصبہ ہے، ''تاریخِ سنی بوہرہ از دیپک بارودلی کر'' میں مذکور ہے کہ ''بودھان'' کے پیر صاحب کی زیرِ قیادت ہونے والے جہاد میں اسلامی لشکر اور انگریزوں کے مابین اسی مقام پر مڈ بھیڑ ہوئی تھی، جس میں بدقسمتی سے مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی؛ تاہم اسی جہاد کی وجہ سے یہاں کے لوگ آج بھی باہمت، پرحوصلہ، جفاکش اور جنگ جو سمجھے جاتے ہیں۔

اس قصبہ کے بعض اکابر سے سنا گیا ہے کہ یہ قصبہ تقریباً نو سو سال پرانا ہے ؛لیکن ابھی تک معتمد ذرائع سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوسکی ہے، البتہ گاؤں کے ایک معمر ترین فرد جناب ''باوا بھولا صاحب ولادت ۱۹۱۶ء'' جو ''جمعیۃ علمائے ہند'' کے قدیم رکن اور جہاں دیدہ بزرگ ہیں، ان کے کہنے کے بموجب ان کے بچپن میں جامع مسجد کوساڑی کے حوض پر ایک کتبہ لگا ہوا تھا، جس میں تاریخ بنائے حوض اور بانی کا تذکرہ تھا، جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ حوض تین سو سال پہلے تعمیر ہوا تھا اور اب اس بات کو چار سو سال ہو رہے ہیں، گویا چار سو سال پہلے یہ بستی بالیقین موجود تھی۔

قصبے کے معتمد بزرگوں سے یہ بھی سنا گیا کہ ''والیا'' کے قرب وجوار میں ''دھور گاؤں بھیلول'' نامی مقام پر تیلیوں کی آبادی تھی جہاں سے پانچ بھائی ایک بزرگ کے ہاتھ پر مسلمان ہوکر یہاں پہنچے تھے، تین بھائی کوساڑی میں مقیم ہوئے اور دو بھائی لوہارا میں رہے، اسی بنیاد پر ان کی اولاد کو ''پانچ بھایا'' کے نام سے جانا گیا، بعد میں جوں جوں آبادی بڑھتی گئی، لوگ اپنے پیشے، ہنر، اور اچھی بری صفات کی طرف منسوب ہوکر مختلف ناموں سے پہنچانے جانے لگے؛ البتہ بعض برادریاں دوسری جگہوں سے بھی یہاں پہنچی ہیں، مثلاً رندیرا برادری کو ''رندیری'' کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ **واللہ اعلم !**

اس قصبے کو اپنے اطراف میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، چوں کہ چرپٹّا، وستان، موسالی، گڑ کاچھ، شاہ، سیلوڈی، کرساڈ اور آمندیرا وغیرہ گاؤں اسی بستی سے بسے ہیں، اس وجہ سے اس کو ''ام القریٰ'' بھی کہا جاتا ہے۔

گاؤں کو دینی اعتبار سے شروع ہی سے بلند مقام حاصل رہا، ملک کے چوٹی کے علما مثلاً مفتیِ اعظم ہند مولانا کفایت اللہ صاحبؒ، حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ، مولانا ابوالوفا صاحب شاہ جہاں پوریؒ، مولانا قاسم صاحب شاہ جہاں پوریؒ، حضرت مفتی مہدی حسن صاحب شاہ جہاں پوریؒ، منشی علی دتہ خلیفہ حضرت مدنیؒ، حضرت مولانا غلام حبیب صاحب نقشبندیؒ، مولانا عبید اللہ بلیاویؒ، حضرت مولانا صدیق احمد صاحب باندویؒ، مولانا محمد سعید صاحب راندیریؒ، مولانا احمد اشرف صاحب راندیریؒ، مولانا قاسم شیر پنجاب خلیفہ حضرت مدنیؒ، مولانا عبدالجبار صاحب اعظمیؒ وغیرہ سیکڑوں اکابر علما

کے قدوم میمنت لزوم سے مشرف ہوا، انہی نفوس قدسیہ کی برکت سے یہاں سیکڑوں علما وحفاظ پیدا ہوئے، بل کہ کسی زمانہ میں ''کوساڑی'' اور ''ترکیسر'' کے علاوہ خال خال ہی کسی جگہ علما پائے جاتے تھے، الحمدللہ! اس گاؤں کا شاید ہی کوئی گھر ایسا رہا ہوگا، جس میں کوئی حافظ وعالم وغیرہ نہ ہو، **وذلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء .**

اس گاؤں کا حضرت مدنیؒ سے بہت گہرا تعلق رہا ہے، حضرتؒ یہاں متعدد بار تشریف لائے؛ بل کہ آخری بار ''حافظ محمد سورتی صاحب عرف حافظ شیر مارڈ یلے والے'' کی دعوت پر رمضان المبارک میں اعتکاف کے لیے بھی قدم رنجائی فرمانے والے تھے؛ مگر افسوس کہ اس سال حضرتؒ کا سانحۂ ارتحال پیش آیا اور یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ یہاں صوفی عبدالغفور صاحب بنگالیؒ مجاز حضرت علامہ کشمیریؒ، مولانا محمد یاسین صاحب مرادآبادیؒ اور مولانا قاری رشید احمد بزرگؒ، حضرت مولانا اسماعیل صاحب بدات جیسے سربرآوردہ علما، فضلا اور اصحابِ طریقت بزرگوں نے برسوں خدمات انجام دی ہیں۔

مذکورہ تاریخِ کوساڑی جامعہ کے شعبۂ عالمیت کے مؤقر استاذ اور ہمارے اصل وطن کوساڑی کے متوطن مفتی اسماعیل صاحب کو بندے نے مکلّف کیا اور موصوف نے مذکورہ بالا تاریخ لکھ کر عنایت فرمائی۔**فجزاہ اللّٰہ خیرا في الدارین وبارک اللّٰہ في علمہ وعملہ !**

87

کوساڑی ہمارا آبائی وطن رہا ہے، میرے پردادا حاجی ابراہیمؒ وہاں کے متولی رہے ہیں اور غالباً ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان وہ کوساڑی سے وستان منتقل ہوگئے تھے اور پھر وہیں پر ایک چھوٹی بستی وستان کے نام سے آباد ہوگئی، اسی کی طرف نسبت کرکے ہمیں وستانوی کہا جاتا ہے۔

کرانس کوپ:

احقر کی جنوبی افریقہ حاضری کی مناسبت سے کرانس کوپ میں آباد میرے اہل وطن نے ایک تقریب میں نکاح کا انعقاد کیا، جس میں بندے نے پہلے مختصر خطاب کیا، جس میں انہیں کہا کہ '' **وکان أبوھما صالحا** ''کی جیتی جاگتی تصویر مَیں آج آپ حضرات کی صورت میں دیکھ رہا ہوں، کہ ہمارے آباواجداد نے دین کی فکر کی، علما اور صالحین سے محبت کی، تو اللہ نے آپ کے لیے یہاں رزق کے راستے آسان کردیے، لہٰذا دین پر مضبوطی سے جمے رہنا تاکہ ہماری نسل کو اس کا فائدہ ہو۔ اسماعیل بھائی پولیس جن کا بہت بڑا سوپر مارکیٹ ہے وہاں انہوں نے تمام مسلمانوں کے عمدہ کھانے کا انتظام کررکھا تھا اور ہماری بھی بہترین مہمان نوازی کی۔

ایک وقت کی دعوت ہمارے درسی ساتھی حافظ سہیل اسماعیل صوفی کے یہاں تھی، انہوں نے بھی پرتکلف دعوت کی، اس کے بعد ''گرے ٹاؤن'' گئے؛ جہاں پھوپھی زاد بھائی اقبال کے یہاں رات کا قیام اور کھانا تھا، دیگر بہت سے دوست و

احباب بھی وہاں پہنچ گئے تھے، اقبال جام بھولا ،سلیم پولیس ،مولانا عباس ،حکیم پولیس وغیرہ اللہ سب کو اجرِ عظیم سے نوازے۔

ما قبل میں ڈربن اور کرانس کوپ کی رودادِ سفر بیان کی گئی تھی اور اب سفرِ اول کے آخری مرحلے کا تذکرہ ہوگا۔ان شاء اللہ تعالیٰ

پیٹر میرز برگھ، ڈربن، کرانس کوپ اور رات کا قیام پھوپھی زاد بھائی اقبال محمد رندیرا کرانس کوپ کے یہاں کرنے کے بعد صبح پُر تکلف ناشتہ ہوا اور ہم چچا زاد بھائی سلیم یعقوب رندیرا کے ساتھ دوبارہ ''روشنی'' کے لیے روانہ ہوئے ،لیکن واپسی کا وقت قریب ہونے کی وجہ کر سفر کی تیاری بھی سر پر تھی ؛مگر جب ہم ''روشنی'' سے واپس ہوئے تو ''جمعیۃ علمائے ساؤتھ افریقہ'' کی طرف سے دو پروگرام کا نظام بنا ہوا تھا:

(۱) ''دارالعلوم آزادویل''میں خطاب۔

(۲) لینس کی سب سے قدیم مسجد میں خطاب۔

لہٰذا دوسرے دن ہم پروگرام کے مطابق ''دارالعلوم آزادویل'' کے لیے نکل پڑے، جو جنوبی افریقہ کے قدیم اور معیاری مقبول مدارسِ اسلامیہ میں سے ایک ہے ۔مولانا عبدالحمید صاحب وہاں کے ذمے دار ہیں ،مولانا کے کہنے پر کسی ذمے دار صاحب کے یہاں پہنچے، انہوں نے ناشتے کا انتظام کیا تھا؛لیکن افسوس کہ بندے کو ان کا نام یاد نہیں رہ سکا۔ناشتے سے فارغ ہو کر عصر کی نماز ادا کی اور نماز کے بعد مسجد میں موجود طلبہ سے خطاب کیا ،جس میں خاص طور پر ''عصرِ حاضر میں طلبہ اور علما کی

ذمہ داریاں'' پر روشنی ڈالی۔علمائے ربانیین بننے کا طریقۂ کار بیان کیا اور بیان کے بعد مولانا سے مختصر ملاقات ہوئی، ملاقات کے بعد مفتی امجد صاحب کے اصرار پر ان کے گھر جانا ہوا، مفتی امجد ماہر خطیب اور کامیاب استاذ ہونے کے ساتھ ساتھ عارف باللہ حضرت مولانا حکیم اختر صاحب نور اللہ مرقدہ کے خلفائے اجل میں سے ہیں، مولانا نے بہت خاطر مدارات کی اور چند اپنی مرتب کردہ کتابیں بطور ہدیہ بندے کو عنایت فرمائیں ، بندے نے شکراً جزاکم اللہ کہا اور والد صاحب کے ایک خاص دوست ''سَولی بھائی'' کے گھر کے لیے روانہ ہوئے۔

آگے چلنے سے قبل دارالعلوم آزادویل کا تعارف پیشِ خدمت ہے:

دارالعلوم آزادویل:

۱۳۹۲ھ (۱۹۷۲ء) میں جرمسٹن کے ایک طالب علم کے دل میں عالم بننے کی شدید خواہش پیدا ہوئی، ایک طالب علم اور ایک جز وقتی استاذ کے ساتھ اس طالب علم کے اسباق شروع ہوئے ،اس بات کا بالکل اندازہ نہ تھا کہ یہ ایک بڑے مستقبل کی شروعات ہے۔سالانہ طالب علموں کی آمد شروع ہوگئی اور مسجد کے عقبی حصے میں غیر رسمی طور پر ان کے اسباق بھی شروع ہوگئے اور ان طلبا کی رہائش کا انتظام مؤذن صاحب کے کمروں میں کردیا گیا، الحمدللہ! اس متواضع انداز میں چار طالب علموں نے عالمیت کورس کی تکمیل کی اور بیس طلبہ حافظِ قرآن ہوگئے۔

۱۴۰۲ھ (۱۹۸۱ء) میں طلبہ کی مزید درخواستیں موصول ہوئیں، رمضان کے مقدس مہینے میں اس تعلیمی سلسلے کے متعلق قطب الاقطاب شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی خانقاہ اسٹینگر میں مزید مشورہ ہوا اور اس ننھے پودے کو رسمی طور پر ''مدرسہ عربیہ اسلامیہ دارالعلوم آزادویل'' کے طور پر قائم کر دیا گیا۔

۱۴۰۳ھ (۱۹۸۲ء) میں مدرسہ آزادویل میں واقع ایک دومنزلہ عمارت میں قائم تھا، جہاں آٹھ طلبہ باضابطہ عالمیت کورس کی تکمیل کر رہے تھے، ایک ماہ کے قلیل عرصہ میں لوگوں کے مطالبے پر درس گاہ قائم کرنے پر مجبور ہونا پڑا، سال کی تکمیل تک تین مزید حفظ کی درس گاہیں قائم کی گئیں، جس میں تقریباً چالیس طلبہ زیرِ تعلیم تھے اور عالمیت کے طلبہ میں سو فی صد اضافہ ہو گیا۔

جوں جوں طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوا حالات نے مجبور کر دیا کہ مدرسے کی زمین خریدی جائے اور باقاعدہ مدرسہ قائم کیا جائے جو ضرورت پوری کر سکے، جب اللہ تعالیٰ کسی کام کو قبول کر لیتا ہے تو اس کے انتظامات بھی آسانی سے فرما دیتا ہے۔

الحمدللہ! زمین کی خریداری کی تکمیل ہوئی، سالانہ اجلاس کا انعقاد ہوا اور آزاد ایوینو پر مدرسہ قائم ہوا، فی الحال مدرسہ میں ۵۰۰؍طلبہ زیرِ تعلیم ہیں اور ۳۵؍اساتذہ تندہی کے ساتھ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، مدرسہ کی عمارت میں ایک مسجد، حفظ کی درس گاہوں کے لیے دارالقرآن، دارالحدیث، دارالافتا، ایک مطبع، بیس درس گاہیں، ایک کتب خانہ، ایک مطبخ، ایک کھانے کا ہال، ایک مغسلہ، ایک بیکری اور ایک جم موجود ہے اور طلبہ سے متعلق تمام سہولیات دست یاب ہیں، اللہ مدرسے کو دن دونی رات چوگنی ترقیات سے نوازے۔ آمین!

مدرسے کے شعبہ جات

دارالافتا:

مدرسے کا دارالافتا مقامی و بیرونی تمام لوگوں کی خدمات انجام دے رہا ہے، تمام سوالات کے جوابات قرآن وحدیث کی روشنی میں تسلی بخش دیے جاتے ہیں، خواہ وہ سوالات ٹیلی فون، فیکس، ڈاک یا ای میل کے ذریعے موصول ہوں۔

شعبۂ نشرواشاعت:

مدرسے کا یہ شعبہ الحمدللہ دینی کتابوں کی اشاعت جیسے اہم کام کو انجام دے رہا ہے، اب تک یہ شعبہ تقریباً ۳۵۰؍کتابیں شائع کر چکا ہے، جو عوام میں انتہائی مقبول ہیں۔

اشتہار و کتابچے:

شعبۂ نشرواشاعت کی جانب سے مساجد کے لیے اشتہارات، عوام الناس کے لیے دستی اشتہارات شائع کیے جاتے ہیں، تاکہ مختلف دینی موضوعات کے متعلق عوام میں بیداری پیدا ہو سکے، اس طرح اشتہارات انتہائی مفید ثابت ہوتے ہیں اور شعبے کو اس طرح کے اشتہارات کو بار بار طبع کرانے کے لیے مقامی و بیرونی درخواستیں موصول ہوتی رہتی ہیں۔

دینی لٹریچر وتحریروں کا مطالبہ ان بیرونی بھائیوں کی طرف سے مسلسل بڑھ رہا ہے، جو اسلامی کتابوں کو خریدنے کی قوت نہیں رکھتے ،اس سلسلے میں عوام کا تعاون قابلِ قدر ہے،جس کی وجہ سے مدرسہ مستحق مسلمانوں کو مفت کتابیں فراہم کرنے پر قادر ہے۔

النصیحہ :

مدرسے کی جانب سے ایک سہ ماہی مجلّہ ''النصیحہ'' پابندی سے شائع ہورہا ہے، مقامی و بیرونی دونوں طرح کے خریداروں کو معینہ وقت پر پابندی سے موصول ہورہا ہے اب تک تقریباً ۱۳۰ رشمارے شائع ہوچکے ہیں۔

شعبۂ دعوت وتبلیغ ومکاتب:

دارالعلوم آزادویل نے آٹھ سال قبل بحمد اللہ دعوت وتبلیغ ومکاتب کا سلسلہ بھی شروع کیا۔

دعوت آفس:

دارالعلوم نے'' رینڈ فونٹین'' میں ایک'' اسلامک انفارمیشن سینٹر'' قائم کیا ،جہاں سے عوام اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرسکتے ہیں اور مفت اسلامی لٹریچر بھی حاصل کرسکتے ہیں۔''دعوۃ آفس'' سے مفت لٹریچر تقسیم کیے جاتے ہیں لوگ اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے آتے ہیں اور کچھ لوگوں نے اسلام بھی قبول کیا۔الحمدللہ!

مکاتب:

دارالعلوم کی نگرانی میں فی الحال آٹھ مکاتب خدمات انجام دے رہے ہیں اور تقریباً ڈھائی سو طلبہ زیر تعلیم ہیں،دونگراں اور سترہ اساتذہ واُستانیاں ان مکاتب سے منسلک ہیں اور مخلصانہ خدمات کی انجام دِہی میں بھر پور مصروف ہیں۔

مساجد ومصلاۃ:

دارالعلوم نے کاگیسوااور منسی ویل(MUNSIEVILLE) میں مساجد وعبادت خانے بھی تعمیر کرائے ہیں۔

لنڈیلا ریٹپیریٹشن سینٹر:

''لنڈیلا ریٹپیریٹشن سینٹر'' میں مسلمان قیدیوں کی نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے لیے دارالعلوم امام کا انتظام کرتا ہے اور ہر رمضان المبارک میں ان کی افطاری کا بھی انتظام کرتا ہے۔

تخفیف غربت اور فلاحی کام:

''دارالعلوم آزادویل'' دن میں دوبار غریبوں کو کھانا تقسیم کرتا ہے۔سردیوں میں سوپ (شوربہ) کا انتظام،اسی طرح غربت زدہ علاقوں میں روٹیاں اور گوشت کے پارسل تقسیم کیے جاتے ہیں۔موسمِ سرما میں غریبوں کے لیے کمبل کا بھی انتظام دارالعلوم کی جانب سے کیا جاتا ہے۔

خانقاہِ اختری:

اسلام میں تزکیۂ نفس ایک اہم عمل ہے، ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ظاہری و باطنی اصلاح کی بھر پور فکر کرے، اپنے اندر اخلاص، تواضع اور اچھے اخلاق پیدا کرے؛ تاکہ اللہ جل شانہ کی معرفت نصیب ہو اور اس کریم ذات کی محبت دل میں رچ بس جائے، اسی اہمیت کے پیش نظر ہمارے اکابر علما نے ''خانقاہِ اختری'' کا آغاز کیا، جہاں لوگ رمضان وغیر رمضان میں دور دراز سے تزکیۂ نفس کی خاطر تشریف لاتے ہیں اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال کو شرف قبولیت سے نوازے۔ آمین!

یہ ہوا دارالعلوم آزادویل کا تعارف، جس کے مہتمم مولانا عبدالحمید صاحب ہیں، جو جنوبی افریقہ کے باا ثر علما میں سے ہیں اور ان کا ادارہ بھی وہاں کے مقبول اور مشہور اداروں میں سے ایک ہے۔

اللہ ترقیات سے نوازے اور ہر طرح کے شرور وفتن سے محفوظ رکھے۔ آمین یارب العالمین!

''دارالعلوم آزادویل'' میں خطابی نشست کے بعد، والد صاحب کے ایک خاص دوست ''سولی بھائی'' کے یہاں جانا ہوا، چند منٹ وہاں بیٹھ کر ہمارا قافلہ دوبارہ ''لینس'' کی طرف روانہ ہوا؛ جہاں مولانا ابراہیم بھام صاحب کی مسجد میں بیان طے تھا، عشا کے بعد ان کی مسجد میں بیان ہوا، جس میں خاص طور پر اصلاحِ معاشرہ پر روشنی ڈالی گئی،

حاضرین کو اسلام کی تعلیمات سے وابستہ ہونے کی تلقین کی گئی؛ مولانا ابراہیم بھام صاحب نے مسجد کے ایک حصے میں انگریزی داں طبقے کے لیے ترجمہ پیش کیا، اس کے بعد ہمارے والد صاحب کے دوست مولانا حنیف جی بھائی کے یہاں مہمان نوازی ہوئی اور وہاں سے اپنے چچا زاد بھائی سلیم یعقوب رندیرا کے ساتھ دوبارہ ''روشنی'' لوٹ آئے۔

دوسرے دن ''روشنی'' میں ایک نکاح کی مجلس میں شرکت ہوئی؛ مولانا داؤد قاسم صاحب نے بندے کو بیان کے لیے کہا، آپ کے کہنے پر بندے نے ''یَا اَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ'' (سورۃ النساء) کی تلاوت کر کے اس پر قدرے روشنی ڈال کر مقصدِ نکاح سمجھایا، اس کے بعد مولانا نے نکاح خوانی کی۔ مولانا ابراہیم بھام جو جنوبی افریقہ کے اس وقت انگریزی زبان میں سب سے مقبول مقرر اور خطیب ہیں اور مولانا داؤد قاسم صاحب جمعیۃ کے فعال رکن ہیں، مولانا ظہیر، مولانا ابراہیم بھام، مولانا داؤد قاسم، مولانا سلیمان راوت وغیرہ یہ سب حضرات سالِ گذشتہ جامعہ تشریف لائے تھے اور جامعہ کی خدمات سے بہت متاثر ہوئے تھے، اسی موقع پر ان سب حضرات سے دوستانہ تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے۔

اسی دن شام کو قاری ابوبکر صاحب قاضی کے یہاں پُر تکلف دعوت ہوئی، قاری صاحب نے بہت عمدہ دعوتِ طعام کا انتظام کیا تھا۔

اس کے بعد جامعہ کی سب سے پہلی جماعت میں فارغ ہونے والے فاضل ''قاری اقبال صاحب قاضی''، جو قریب ہی ایک مسجد میں امام ہیں، ان کے گھران کے اصرار پر جانا ہوا۔ واقعتاً تمام دوست واحباب نے بڑی ذرہ نوازی کا ثبوت دیا، اللہ اجر عظیم سے نوازے۔ (آمین)

ریڈیو اسلام جنوبی افریقہ لینس کے اسٹیشن کی تفصیلی ملاقات:

میڈیا واقعتاً عصر حاضر میں دعوت و اصلاح کے لیے مؤثر ترین ہتھیار ہے؛ مگر افسوس کہ عصرِ حاضر میں ملحدین اور باطل پرست طاقتوں نے برائی کو عام کرنے کے لیے اسے خوب استعمال کیا اور کررہے ہیں اور اہل حق اس سے غافل ہیں تو آیئے! قبل اس کے کہ ریڈیو اسلام کے ذمے داران سے ملاقات کی تفصیلات کو پیش کیا جائے ''اعلام اور میڈیا'' کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

میڈیا کی تعریف:

مختصراً ہم میڈیا کی تعریف اس طرح کر سکتے ہیں کہ ''ذرائع ابلاغ اور میڈیا وہ تمام ذریعے ہیں، جو ہم تک معلومات پہنچاتے ہیں اور ہمارے بارے میں دوسروں کو معلومات دیتے ہیں''۔

مقاصدِ میڈیا:

(۱) معلومات یعنی علم پہنچانا (۲) کسی خاص مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے رہنمائی کرنا (۳) تفریح بہم پہنچانا۔

موجودہ دور کے اعتبار سے ذرائع ابلاغ کی ۲ر قسم کی جاسکتی ہے:

(۱) تحریری ذرائع ابلاغ یعنی پرنٹ میڈیا:

اس میں اخبار، رسالے، مجلّے، روزنامچے ہفت روزہ، ڈائجسٹ وغیرہ شامل ہیں۔

(۲) الیکٹرونک ذرائع ابلاغ یعنی الیکٹرانک میڈیا:

اس میں ریڈیو، ٹی وی، ٹیلیگرام، ٹیلی فون، کیسٹ، وائرلیس اور سٹیلائٹ کا نیا نظام شامل ہے۔

میڈیا کے اثرات:

میڈیا کا دائرۂ اثر تمام شعبہ ہائے زندگی کو محیط ہے، سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں جب تک ہم ملکی، عالمی، سیاسی، سماجی، خبر پڑھ یا سن نہ لیں، تمام دن ایک تشنگی اور ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے۔

میڈیا کا اثر اس قدر ہے کہ ملک کو مستحکم کرنے میں یا تبدیلیاں لانے میں اس کا اہم کردار رہتا ہے، اسی طرح کے نظام کو لوگوں سے متعارف کرانے یا اسے بدنام کرنے میں میڈیا کا رول نمایاں ہے۔ آج میڈیا کے ابلاغی طریقوں میں اس قدر حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے، جس کو دیکھ کر عقلِ انسانی دنگ رہ جاتی ہے؛ چناں چہ یہ کہنے کا حق ہے کہ میڈیا کا دائرۂ اثر زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہے۔

میڈیا کے اثرات ہماری زندگی کے تمام شعبوں پر واضح انداز میں نمایاں ہیں، اسی وجہ سے ذرائع ابلاغ کسی قوم کا مزاج بنانے اور بگاڑنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں

اگرانہیں مثبت مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے تو اتحاد و یک جہتی کی فضا قائم کرسکتے ہیں اور اگر شر انگیزی کے لیے استعمال کیا جائے تو معاشرت میں بڑی تیزی سے انتشار وفساد برپا کردیتے ہیں۔ تجربات سے واضح ہے کہ جنگ کے موقع پر کس طرح میڈیا کے ذریعے قوم کے اندر قربانی اور محبت کے جذبات کامیابی سے پیدا کیے جاسکتے ہیں اور کسی بھی جگہ دشمنی اور عداوت کا بیج بھی بخوبی بویا جاسکتا ہے، اگر یہ ذرائع دیانت داری سے استعمال کیے جائیں تو قوم کے امین ہوتے ہیں اور جھوٹ کو پیراہن بنالیں تو خیانت کی بدترین مثال ہوتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ کا اثر صرف بین الاقوامی رابطے تک محدود نہیں؛ بل کہ یہ افہام وتفہیم کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہے، ذرائع ابلاغ کی یہ سوچ جس کے ہاتھ میں ہوگی تجارتی منڈیاں اسی کی ہوں گی، اسی کی ثقافت کا راج ہوگا، اسی کا طرزِ تعلیم بالاتر ہوگا۔ (اگرچہ وہ کتنے ہی نقائص کا حامل کیوں نہ ہو) انسانوں کے جذبات، احساسات، خواہشات، اسی کی مرضی کے تابع ہوں گے، اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ ذرائع ابلاغ انسانی ذہن کو مسحور کردیتے ہیں کہ وہ خود کچھ نہیں سمجھتا نہ سوچتا ہے؛ بل کہ وہی بولتا ہے، وہی کھاتا ہے، وہی پہنتا ہے، وہیں رہنا چاہتا ہے جہاں کے لیے ذرائع اسے تیار کردیتے ہیں۔

الغرض! شعوری یا لاشعوری طور پر ہر فرد میڈیا کی گرفت میں ہے۔

میڈیا اور ثقافت:

ثقافت وہ ورثہ ہے جو ادب، فنِ معیشت، معاشرت، رسم و رواج، عقائد ونظریات اپنی آیندہ نسلوں کو منتقل کرتی ہے اور آج تہذیب وتمدن کی بقا اور ترقی کا انحصار مضبوط میڈیا پر ہے۔

آج وہ قومیں جو میڈیا پر قابض ہیں، اپنے مخصوص عزائم کی تکمیل اور مفاد کے حصول کے لیے دوسری قوموں خصوصاً مسلمانوں کے ثقافتی اقدار میں بگاڑ پیدا کرنے کے لیے ہر حربہ آزمارہی ہیں، ان کا مقصد قطعی انسانیت کی بھلائی نہیں۔

آج ضرورت ہے کہ ہم میڈیا کا جواب میڈیا سے دیں، میڈیائی حملوں کا جواب میڈیا ہی کے ذریعہ دیا جاسکتا ہے، ورنہ ہم ان کے شکار بنتے جائیں گے اور خود کو بے عقل کر کے ان کی نقل کرکے خود کو ان کی تہذیب کا غلام بنالیں گے، جس کا آج ہم کھلی آنکھوں مشاہدہ کررہے ہیں۔ کل تک ہمیں اپنی زبان پر فخر تھا، ہمیں یقین تھا کہ ہم ترقی کرسکتے ہیں تو اپنی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنا کر کرسکتے ہیں؛ مگر یہ میڈیا ہی کا جادو ہے جو ہم پر اثر انداز ہوچکا ہے، ہم نے ان کے آگے گھٹنے ٹیک دیے، ان کی زبان کو اپنے لیے باعثِ ترقی اور فخر کا سامان سمجھ رکھا ہے، نتیجتاً تعلیمی میدان بھی انگریزی کا غلام ہوگیا اور ہم نے بدوں انگریزی ترقی کو محال گردانا اور جب ہم نے ان کی زبان کو بالادستی دے دی تو ان کا کلچر، ان کی تہذیب بھی لاشعوری طور پر ہمارے اندر سرایت کرگئی اور کرتی جارہی ہے۔

الغرض! ہم مانیں یا نہ مانیں ذہنی اور عملی طور پر ہم محکوم ہوچکے ہیں۔

(مستفاد: عالم اسلام پر یہود ونصاری کے ذرائع ابلاغ کی یلغار)

مواصلات مغربی ثقافت کا ہتھیار:

عالمگیر یوں کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ مستقبل میں اگر سیاسی اور اقتصادی میدان میں بالا دستی قائم رکھنی ہے تو امریکی ثقافت کی بھی عالم کاری کرنی ہوگی ، پوری دنیا میں اس تہذیب کو فروغ دینا ہوگا اور سارے عالم کے لوگوں کو اس ثقافت کا گرویدہ بنانا ہوگا، اس مقصد کے لیے انھوں نے ''مواصلات'' یعنی میڈیا کو ذریعہ بنایا۔

وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ پورے عالم کو دست نگر کرنے کے لیے پورے عالم پر مغربی ثقافت تھوپنے کے لیے امریکی طرزِ زندگی کو مثالی اور قابلِ تقلید بنانا ہوگا، لوگوں کی عقلوں پر کمند ڈال کر ان کو اپنے قابو میں لینا ہوگا؛ لہٰذا لوگوں کے افکار و خیالات پر شب خون مارنے کے لیے انھوں نے ذرائع ابلاغ کا انتخاب کیا اور اس راہ سے پوری دنیا میں امریکی ثقافت کو قابلِ تقلید بنانے کی کامیاب ؛مگر مسموم کوشش کی۔

درحقیقت عالمگیر یوں نے یہ طریقۂ کار یونانیوں سے اخذ کیا تھا، 'سقراط'' کے زمانے میں ہی یونان کے فرماں رواؤں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ محض سیاست کے گلیاروں پر قبضہ کر لینا یہ اقتدار کو دوام بخشنے کے لیے کافی نہیں، اس کے دوام کے لیے عوام کی ذہن سازی کرنی ہوگی ، یہی طریقہ عالمگیر یوں نے اپنی تحریک کو دوام بخشنے کے لیے اختیار کیا اور اس طریقہ کو ہمہ گیر بنانے کے لیے ذرائع ابلاغ کا انتخاب کیا۔

مواصلات دراصل ایسے افعال کا مجموعہ ہیں، جن کے ذریعے لوگ آپس میں جذبات، احساسات، تاثرات، افکار و خیالات اور معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں۔

محدود اور غیر محدود ہونے کے اعتبار سے ذرائع مواصلات کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایسے محدود وسائل جو محدود افراد کو باہم مربوط کر دیں، ان وسائل میں ٹیلی فون، فیکس وغیرہ کے ساتھ ساتھ جلسے، کانفرنس اور سیمینار بھی شامل ہیں، چوں کہ یہ بھی چند افراد کے باہمی رابطے کا ذریعہ ہیں۔

(۲) ایسے وسائل جو غیر محدود افراد تک بات پہنچانے کا ذریعہ ہوں، ان میں اخبار، ٹی وی، سنیما، فلمیں، ٹی وی کے اشتہارات اور انٹرنیٹ وغیرہ داخل ہیں۔

امریکی ثقافت کے فروغ میں دوسری قسم کے وسائل نے اہم کردار ادا کیا ہے، جس پر امریکہ نے آغاز ہی سے اپنا کنٹرول قائم کر لیا تھا اور امریکہ کے واسطے سے یہودیوں نے ذرائع ابلاغ کو اپنے قبضے میں کر رکھا ہے، جو آج تک انھی کے زیر اثر ہے اور بدقسمتی سے جمہوریت کا چوتھا ستون کہلاتا ہے۔

(مستفاد: گلوبلائزیشن اور اسلام)

امریکی میڈیا:

یوں تو امریکی ذرائع ابلاغ کو ''امریکی میڈیا'' کہا جا سکتا ہے؛ لیکن در حقیقت یہ خالص یہودی میڈیا ہے، جو اربِ پتی یہودی تاجروں کے زیرِ اثر ہے اور یہودی کمیونٹی کا سب سے بڑا ہتھیار سمجھا جاتا ہے، حتیٰ کہ امریکی سیاست پر بھی اس کی

اتنی گہری چھاپ ہے کہ انتخاب میں کھڑا ہونے والا ہر امیدوار اپنی جیت کو یقینی بنانے کے لیے یہودی میڈیا کی خوشامد کرتا نظر آتا ہے، دراصل یہودیوں نے اپنے دانش وروں کے ''پروٹوکولز'' کو عملی جامہ پہنایا ہے''یہودی پروٹوکولز'' کے بارہویں باب میں درج ہے کہ ''ہماری منظوری کے بغیر کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ خبر کسی سماج تک نہیں پہنچ سکتی، اس بات کو یقینی بنانے کے لیے ہم یہودیوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ خبر رساں ایجنسیاں قائم کریں، جن کا بنیادی کام ساری دنیا کے گوشے گوشے سے خبروں کا جمع کرنا ہو، اس صورت میں ہم اس بات کی ضمانت حاصل کر سکتے ہیں کہ ہماری مرضی اور اجازت کے بغیر کوئی خبر شائع نہ ہوسکے۔''

یہودی اپنے ''پروٹوکولز'' کو تشکیل دینے سے پہلے ہی امریکہ میں ۱۸۴۸ء میں ایک خبر رساں ایجنسی قائم کر چکے تھے، اس ایجنسی کو امریکہ کے پانچ بڑے روزناموں نے مل کر ''ایسوسی ایٹیڈ پریس'' کے نام سے قائم کیا، نصف صدی گزر جانے کے بعد ۱۹۰۰ء میں یہ ایجنسی، عالمی سطح پر کام کرنے لگی اور امریکہ میں شائع ہونے والے تمام اخبارات ورسائل سمیت دنیا کے دیگر علاقوں کے ذرائع ابلاغ کو خبریں فراہم کرنے لگی، ۱۹۸۴ء کے اعداد وشمار کے مطابق اس ایجنسی سے امریکہ میں تیرہ سو (۱۳۰۰) روزنامے اور تین ہزار سات سو اٹھاسی (۳۷۸۸) ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن وابستہ ہیں، امریکہ سے باہر گیارہ ہزار نو سو ستائیس (۱۱۹۲۷) روزنامے، ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن وابستہ ہیں، سیٹلائٹ اور دیگر ذرائع سے روزانہ، ۱۷ملین (ایک کروڑ ستر لاکھ) الفاظ پر مشتمل مضامین میڈیا کو فراہم کیے جاتے ہیں، اقتصادی اور

مالی خبروں کے خاص شعبے ہیں، جہاں سے پوری دنیا کے ۸؍ ہزار مرکزی بنکوں کو تازہ ترین خبریں فراہم کی جاتی ہیں، ان خبروں کا معاوضہ غیر معمولی حد تک گراں ہوتا ہے، اس نیوز ایجنسی کے امریکہ میں ایک سو سترہ (۱۱۷) دفاتر اور غیر ملکوں میں ۸۱؍اخباری مراکز ہیں، جہاں پانچ سو انسٹھ (۵۵۹) نامہ نگار متعین ہیں، ایجنسی میں کام کرنے والے ایڈیٹروں اور صحافیوں کی تعداد جو صدر دفتر میں متعین ہیں، ڈھائی ہزار (۲۵۰۰) ہے، یہ ایجنسی صد فی صد یہودی سرمایے سے چلتی ہے، اس کے علاوہ ۹۵؍فی صد کارکن یہودی ہیں، اس لیے اس کو ''یہودی نیوز ایجنسی'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

۱۹۰۷ء میں امریکہ کے دو یہودی سرمایہ کاروں نے ''یونائیٹڈ پریس'' کے نام سے ایک نیوز ایجنسی کی بنیاد ڈالی، اس کے دو سال بعد ۱۹۰۹ء میں ''انٹرنیشنل نیوز سروس'' کے نام سے کمپنی قائم ہوئی، جس نے بعد میں ایسے عالم گیر اشاعتی ادارے کی حیثیت اختیار کرلی، جس کی شاخیں دنیا بھر میں پھیل گئیں، یہ دونوں نیوز ایجنسیاں صد فی صد یہودیوں کی تھیں، پھر ۱۹۵۸ء میں ''یونائیٹڈ پریس'' اور انٹرنیشنل نیوز سروس'' آپس میں ضم ہوگئیں اور ''نیویارک ٹائمز'' کی ملکیت میں آگئیں جو ایک یہودی کے ماتحت ہے، ۱۹۸۴ء میں ان کو ''میڈیا نیوز کارپوریشن'' میں ضم کردیا گیا، اس نیوز ایجنسی کے خریداروں کی تعداد سات ہزار اناسی (۷۰۷۹) ہے، جن میں دو ہزار دو سو چھیالیس (۲۲۴۶) خریدار (اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن) امریکہ سے باہر کے ہیں، اس مرکزی خبر رساں ایجنسی کے ماتحت، ۳۰؍خبر رساں ایجنسیاں پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔

"یونائیٹڈ پریس انٹرنیشنل" سے امریکہ میں گیارہ سو چونتیس (۱۱۳۴) اخبارات، پبلشنگ ادارے اور تین ہزار چھ سو ننانوے (۳۶۹۹) ریڈیو اسٹیشن وابستہ ہیں، پوری دنیا میں اس ایجنسی کے ایک سو ستہتر (۱۷۷) مراکز ہیں، صرف امریکہ میں اس کے چھیانوے (۹۶) دفاتر ہیں، روزانہ ۱۸رملین الفاظ پر مشتمل مضامین اور خبریں خریداروں کو بھیجی جاتی ہیں، جب کہ روزانہ بیاسی (۸۲) تصاویر بھیجنے کا اوسط ہے۔

عالمی نیوز ایجنسیوں کا جب تذکرہ آتا ہے تو مشہور خبر رساں ایجنسی "رائٹر" کا بھی ذکر آتا ہے، یہ ایجنسی برطانیہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے ذرائع ابلاغ کو سب سے زیادہ خبریں فراہم کرتی ہے؛ لیکن خود اس ایجنسی کا حال یہ ہے کہ اس کی اکثر خبریں امریکی خبر رساں اداروں سے ماخوذ ہوتی ہیں، اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امریکہ کے پاس خبر رساں ایجنسیوں کا ایسا "بلاک" ہے، جو دنیا میں شائع ہونے والی ۹۰رفی صد خبروں کا واحد ذریعہ ہے، اس کے علاوہ امریکی اخباروں میں ۱۸۵۱ء سے مسلسل شائع ہونے والے اخبارات میں "نیویارک ٹائمز"، ہیرالڈ ٹربیون"، رسائل ومجلّات میں "ریڈر، ڈائجسٹ، نیشنل جگرافک، میگزین، ٹائم اور نیوز ویک"، ٹی وی چینلوں میں "N.B.C"، "A.B.C." اور ۱۹۸۰ء سے عالمی سطح پر مشہور ہونے والے چینل CNN کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، جو بلا مبالغہ پوری دنیا میں امریکی پالیسی کے لیے ماحول سازگار کرنے میں سب سے زیادہ مدد ومعاون ثابت ہوتے ہیں، امریکہ اپنے مضبوط ترین ذرائع ابلاغ کی وجہ سے ہی کروڑوں لوگوں

کے افکار وخیالات کو ہم آہنگ بنانے میں کامیاب ہوسکا ہے، اس وسیع ترین میڈیائی جال ہی کی بہ دولت امریکی ثقافت اور رسوم ورواج پوری دنیا میں پھیلے ہیں، حتی کہ امریکی میڈیا نے اس بات پر بھی اپنی توجہ مرکوز کی ہے کہ لوگ خواہ دنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھتے ہوں امریکن انداز ہی پر انگلش زبان لکھیں اور امریکی طریقے کے مطابق ہی انگلش لفظ کی "اسپیلنگ" کریں۔

امریکی میڈیا کی قوت کا اندازہ عمومی سطح پر پہلی خلیجی جنگ کے موقع پر ہوا، جب کہ عراق میں پوری طرح امریکی ذرائع ابلاغ کا کنٹرول تھا، امریکی نیوز ایجنسیوں اور ٹی وی چینلوں نے حقیقت بیانی سے کام نہیں لیا، بل کہ امریکی حکومت کی منشا کے مطابق خبریں نشر کیں، نیز جنگ سے پہلے پوری دنیا میں امریکہ کے حق میں فضا سازگار کی اور عراق کو ایک دہشت گرد ملک کی صورت میں پیش کیا۔

(ماخوذ: گلوبلائیزشن اور اسلام)

مواصلاتی دنیا پر امریکی سایہ:

امریکہ کے نزدیک عالمی مواصلاتی نظام کتنی اہمیت رکھتا ہے، اس کا اندازہ سابق امریکی صدر "بل کلنٹن" اور نائب صدر "ایل گور" کے ایک انتخابی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ "امریکہ کے لیے بنیادی جنگوں میں سے ایک جنگ "ذرائع ابلاغ" سے تعلق رکھتی ہے"، ایل گور نے یہ بھی اعتراف کیا کہ امریکہ گذشتہ ۱۰رسالوں میں اس جنگ کو جیتنے کے لیے ۱۰۰رعرب ڈالر سے زائد خرچ کر چکا ہے۔

مواصلاتی دنیا کو زیر اثر کرنے میں اس خفیہ جنگ میں امریکہ کے ساتھ اس کے طاقت ور حلیف بھی شامل ہیں، جو صنعتی اور مالیاتی اداروں کی شکل میں پوری دنیا میں سرگرم ہیں، ان اداروں میں TCI، ٹام وارنر، یوایس ویسٹ (Uswest) اور فیکوم کمپنی قابل ذکر ہیں، جو ہالی ووڈ کی سینما کمپنی کی خریدار ہے۔

اسی طرح ''بلاک بسٹر انٹرٹینمینٹ'' دوسرے نمبر پر ہے، اسی طرح ''ہاکرز'' AT&T سلگن گرافکس (Silicon graphics) اور ٹائم وارنر کا گروپ مستقل سیٹلائیٹ نظام اور بڑے بڑے مواصلاتی نیٹ ورک کا مستقل تجربہ کررہی ہے، جس سے بیک وقت نصف ہزار ملین سے زائد لوگ جُڑ سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا کمپنیاں عالمی مواصلاتی نظام کو امریکہ کے زیرِ نگیں کرنے کے لیے اس کی پوری طرح معاونت کررہی ہیں، موجودہ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ یہ خفیہ اور غیر اعلانیہ جنگ اپنے اختتام پر ہے اور اس جنگ میں بھی دیگر جنگوں کی طرح فتح کا سہرا امریکہ کے ہی سر ہے۔

پروپیگنڈہ ایک مؤثر ہتھیار:

''فرانسو برون'' کا کہنا ہے کہ ''پروپیگنڈہ'' ذہین لوگوں پر احمقانہ تاثرات ڈالنے کا نام ہے، اس لیے امریکہ نے ایک مؤثر ہتھیار کی شکل دی ہے اور اس کا استعمال دوسری جنگ عظیم کے بعد کیا، اس طور پر کہ فتح کا سہرا برطانوی فوج کے سر باندھنے کے بجائے امریکی ذرائع ابلاغ نے امریکی فوج کے سر باندھا، یہ پروپیگنڈہ اتنا مؤثر ثابت ہوا کہ پوری عوام کو یہ یقین ہوگیا کہ امریکہ ان کے لیے کسی مسیحا سے کم نہیں ہے۔

آج امریکی میڈیا اس پوزیشن میں ہے کہ وہ پوری دنیا کو جس نہج پر اور جس سمت میں لے جانا چاہے لے جاسکتا ہے، لوگ غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر میڈیا کے ذریعے پھیلائی جارہی باتوں کو بسر وچشم قبول کرتے ہیں۔

امریکی ثقافت کا نقیب ''ہالی ووڈ'':

سینما کا آغاز اگرچہ یورپ نے کیا؛ لیکن امریکہ نے اپنے آپ کو موجد ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی، یورپی فن کاروں کو اپنے یہاں مدعو کیا اور ان کے ذریعے فلمیں بنائیں، پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے درمیان بنائی جانے والی جن فلموں نے شہرت پائی، ان میں ۸۰؍ فی صد فلم ''ہالی ووڈ'' کی بنائی ہوئی تھیں، جن میں یورپی فن کاروں نے کام کیا تھا۔

ان فلموں کی شہرت اور ان کے اثرات سے امریکیوں کو اندازہ ہوگیا کہ عقلوں کو سحر زدہ کرنے اور امریکی طرزِ زندگی کو مثبت انداز میں پیش کرنے کے لیے ''فلم'' ایک مؤثر ہتھیار ہے؛ چناں چہ انہوں نے اپنی ثقافت اور تمدن کو فروغ دینے اور اپنی اقدار وروایات کو رواج دینے کے لیے ''فلموں'' کا سہارا لیا، جس طرح صنعت وتجارت کے میدان میں اپنی بالاتری اور اجارہ داری قائم کی، اسی طرح فلموں کے میدان میں بھی غلبہ حاصل کیا، مختلف معاہدوں اور حیلوں کی آڑ لے کر امریکی فلموں کو عالمی سطح پر پھیلایا گیا۔

اس فلمی سیلاب کا اثر یہ ہوا کہ فرانسیسی تہذیب نے امریکی تمدن کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے، جب کہ فرانس خود بھی ''فلم سازی'' کے میدان میں قدم رکھ چکا تھا اور اس کی فلمی صنعت اٹلی اور جرمنی سے زیادہ بہتر تھی، لیکن فرانسیسی ٹی وی پر ۷۰/ ۸۰/فی صد امریکی فلمیں دکھلائی جانے کی وجہ سے فرانس محض اپنے باشعور قائدین کی بہ دولت اپنی زبان کے علاوہ کچھ نہ بچا سکا۔

''ہالی ووڈ'' نے تو امریکی ثقافت کی نشر واشاعت دنیا کے گوشے گوشے میں کی ،لیکن خود امریکہ نے غیر ملکی فلموں کے لیے ایسی پالیسی وضع کر دی کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے ملک کی ثقافت ''امریکہ'' میں رائج نہ کر سکیں۔

امریکی ثقافت کو فروغ دینے کا کام کتنے منظّم انداز سے چل رہا ہے، اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ امریکہ کی ۶/ بڑی کمپنیاں جو عالمی بازار پر حاوی ہیں، جب کسی ملک کے ساتھ کوئی بڑا سودا کرتی ہیں تو ساتھ میں ان کی یہ شرط بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے یہاں ان امریکی فلموں کو آزادی کے ساتھ دکھائے جانے کی اجازت دیں، جو کسی وجہ سے امریکہ اور یورپ میں نہیں چل سکیں اور پٹ گئیں۔

امریکی فلموں کی عالمی سطح پر تشہیر کی وجہ سے کوئی ملک امریکی ثقافت سے باقی نہ بچ سکا، خصوصاً نوجوان اکثریت اپنی قومی مذہبی تہذیب وتمدن کو خیر باد کہہ کر امریکی ثقافت کی دل دادہ بن گئی ہے اور یہی عالم گیریت کا مقصد بھی ہے۔

عالمی لباس:

ہر قوم کا مخصوص لباس اس کی تہذیب وثقافت کا آئینہ دار ہوتا ہے، لباس ہی سے قوموں کی تاریخ اجاگر ہوتی ہے اور ان کے رہن سہن کا پتہ چلتا ہے، یہ تمدن کی روح اور تہذیب کی بنیاد ہے۔

گلوبلائیزیشن کے سیلِ رواں نے جہاں سیاسی جغرافیے میں تبدیلی کی ، اقتصادی صورت حال کو بدلا، پوری دنیا میں امریکی ثقافت کو پھیلایا، وہیں امریکی لباس کو بھی عام کیا اور قومی لباس کا خاتمہ کر دیا، ''ہالی ووڈ'' کی فلموں کا اثر یہ ہوا کہ امریکی لباس پہننا ترقی کا شعار بن گیا اور بلند معیار زندگی کی علامت قرار پایا، جب کہ قومی لباس پہننا دقیانوسیت اور پستی کی دلیل سمجھا گیا۔

یہ صورت حال موجودہ دور میں تقریباً ساری دنیا میں دیکھنے کو مل رہی ہے، لڑکیوں نے اپنے قومی لباس کو ترک کر کے امریکی فحش لباس اپنا لیے ہیں اور قومی لباس جس کو ثقافت کی پہچان کہا جاتا ہے تقریباً ختم ہو رہے ہیں، ٹی وی چینلوں اور امریکی فلموں نے ہی اس نئے عالمی لباس کو پھیلانے میں سب سے بڑا کردار ادا کیا ہے۔

ماکولات ومشروبات میں اندھی تقلید:

امریکہ نے محض اپنے لباس کو ہی سارے عالم میں نہیں پھیلایا؛ بل کہ ساتھ ساتھ امریکی ماکولات ومشروبات کو بھی پوری دنیا میں رواج دیا۔

حالاں کہ دیگر اقوام اور ملکوں میں ان ماکولات سے کہیں عمدہ، لذیذ اور انواع واقسام کے مفید کھانے پینے کی ہزار ہا اقسام پائی جاتی تھیں، جن میں اٹلی، فرانس، اسپین، یونان، برازیل، چین، ہندوستان اور عالمِ اسلام کو ایک خصوصی امتیاز حاصل تھا۔

لیکن ثقافتی سیلاب نے چند بے ذائقہ کھانے کو فیشن اور ترقی کا نام دے کر فاسٹ فوڈ کو لوگوں کی پہلی پسند بنا دیا، جسے دیکھیے ہاٹ ڈوگ، ہیمبر گر، پیزا کھانے کا دل دادہ ہے اور امریکی ثقافت کی نمائندگی کرنے والے ''مکڈانلڈ، برگرکنگ اور پیزا ہٹ'' کو اپنی ثقافت وتہذیب کو بھلا کر آباد کر رکھا ہے۔

اور ایسا نہیں کہ یہ بس یونہی لوگوں کی پسند بن گئے، بل کہ امریکہ نے اس پر بڑی محنتیں کی ہیں اور اب بھی کر رہا ہے، بل کہ اس کی بڑی بڑی یونی ورسٹیاں اور تربیتی مراکز قائم کی ہیں اور بڑے پیمانے پر اس کی ٹریننگ جاری ہے، اسی طرح مشروبات پر ''کوکا کولا'' اور ''پیپسی'' کا مکمل قبضہ ہے۔

ثقافتی عالم گیریت اور اس کے اثرات:

عالم گیریت ثقافتی پہلو کے اعتبار سے دو بنیادوں پر قائم ہے:

(۱) انفارمیشن اینڈ ٹکنالوجی کا فروغ، جس میں ذرائع ابلاغ اور فلمیں وغیرہ بھی داخل ہیں۔

(۲) قوموں اور معاشروں کے درمیان مشابہت اور یکسانیت کا بڑھتا ہوا تناسب، یعنی پوری دنیا کو ایک ہی طرح کی تہذیب وتمدن کا غلام بنا دیا جائے اور

روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کو سیٹیلائٹ، انٹرنیٹ اور ٹیلی ویژن کے ذریعے ایک دوسرے سے جوڑ دیا جائے؛ تاکہ ایک مخصوص طبقہ جب بھی چاہے اپنے نظریات وخیالات کو، ان آلات کے ذریعے پوری دنیا میں پھیلا دے اور نتیجۂ کار ہر قوم اپنی مذہبی وثقافتی روایت واقدار کو پسِ پشت ڈال کر اس حیوانی تہذیب پر عمل پیرا ہو جائے۔

(مستفاد: گلوبلائزیشن اور اسلام)

موجودہ حالات کے تناظر میں میڈیا کا مقابلہ میڈیا ہی سے مسلمانوں کے لیے موٴثر انداز میں کرنا از حد ضروری ہو چکا ہے؛ مگر مقامِ افسوس وحسرت ہے کہ امت کا ہر طبقہ چاہے علما، سیاست داں، تجار ہوں یا رفاہی دعوتی واصلاحی کام کرنے والے افراد اور ادارے اس جانب بالکل متوجہ نہیں یہاں تک کہ انھیں اس کمزوری کا احساس تک نہیں جب کہ مشہور کہاوت ہے ''لوہا لوہے کو کاٹتا ہے'' لٰہذا ہمیں میڈیا کے پروپیگنڈے اور فریب کا مقابلہ میڈیا ہی سے کرنا ہوگا، البتہ اسلامی اصول اور دائرے میں رہتے ہوئے، ورنہ بجائے فائدے کے نقصان اٹھانا پڑ سکتا ہے۔ اس کے لیے ایسے علما سے رجوع کرنا ہوگا، جو اسلامی علوم میں کامل مہارت کے ساتھ معتدل فکر وجہاں دیدہ ہوں اور ساتھ ہی ساتھ موجودہ حالات میں امت کی صحیح رہنمائی ورہبری کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

ریڈیو اسلام:

جنوبی افریقہ کے مسلمانوں اور خاص طور پر علما نے میڈیا کی اس اہمیت کو محسوس کیا اور آج سے تقریباً ۲۵ر سال قبل جس وقت سب سے بڑی اہمیت کی حامل میڈیا کی ضرورت تھی ''ریڈیو اسلام'' کو شروع کیا، اس سلسلہ میں ہماری مولانا حیدر اور مولانا سلیمان راوت صاحبان سے تفصیلی گفتگو ہوئی جو آگے ذکر کی جائے گی۔

سردست ''ریڈیو اسلام'' کا تعارف پیش خدمت ہے:

نومبر ۱۹۹۳ء میں بہ طور ایک کمپنی دفعہ ۲۱ر کے تحت ریڈیو اسلام کا اندراج عمل میں آیا اور اپریل ۱۹۹۷ء میں نشریاتی لائسنس بھی حاصل ہو گیا اور سب سے پہلی اشاعت ۱۰ر اپریل کو عمل میں آئی۔ ابتدا سے ہی ریڈیو اسلام نے اپنے مخصوص مذہبی مضامین کی بنیاد پر سامعین کو کافی متأثر کیا اور اس کا حلقہ وسیع ہو گیا، زبردست مہارت اور مختلف النوع مضامین نے لیشیا سے باہر بھی سامعین کی ایک بڑی تعداد کو اپنی طرف مائل کیا، ریڈیو اسلام کے تمام تر مواد قرآن وحدیث پر مبنی ہوتے ہیں۔

ریڈیو اسلام میں کیا ہوتا ہے؟

ریڈیو اسلام کا مقصد اسلامی پیغام کو فروغ دینا ہے، یہ اسلامی اقدار کا دوسرا نام ہے اور جنوبی افریقہ اور بیرون میں مسلمانوں اور اسلام کے متعلق پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے کا ایک آلہ ہے۔ یہ ریڈیو اسٹیشن ہدایت کی ایک روشنی اور دنیا

کے لیے ایک دعوت بن چکا ہے۔ اپنے تعلیمی اور معلوماتی نشریات کے ذریعے ریڈیو اسلام منقسم سماج کو جوڑنے کے لیے ایک شاہ راہ بن چکا ہے۔ ریڈیو اسلام جنسی، نسلی، سیاسی، طبقاتی، مذہبی، لسانیاتی اور نااہلیتی جیسے تمام بھید بھاؤ اور فرق کا مخالف ہے۔ ریڈیو اسلام اِس کہاوت کے معیار پر پورا اترتا ہے کہ آپ کا پسندیدہ تعلیمی اسٹیشن اور دنیا ہمارا سماج ہے۔

مقاصد:

برقی لہروں کے ذریعے ہر ایک تک اسلام کی تعلیم کا فروغ۔

معتبر خبریں اور موجودہ واقعات و پروگرام اور اس پر تبصرہ۔

سامعین:

آر، اے، ایم، ایس سروے کے مطابق ریڈیو اسلام کے سامعین کی موجودہ تعداد ۸۹۰۰۰ر ہزار ہے۔ ریڈیو اسلام کا ہدف تمام عمر کے مسلمان مرد وعورتیں اور بچے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں اِس ریڈیو نے سامعین میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ اپنے معیاری مضامین ومواد کی بنیاد پر دوسرے سماج میں بھی اپنا راستہ ہموار کر لیا۔ ریڈیو اسلام باضابطہ مقامی وبین الاقوامی رہنماؤں کے خیالات پیش کرتا رہتا ہے۔

نشریاتی زبانیں:

انگریزی ۹۶ر فی صد۔ عربی اور اردو ۲ر فی صد۔ افریکان/ زولو/ روسا ۲ر فی صد۔

ریڈیواسلام سٹیلائٹ کے ذریعہ اپنے پروگرام کیپ ٹاؤن سے لے کر ''یوگانڈ'' تک نشر کرتا ہے اور ممکنہ سامعین کی تعداد ایک لاکھ ہوتی ہے۔ اب ریڈیو اسلام کو پوری دنیا میں اس کی ویب سائٹ سے بھی سنا جاسکتا ہے ۔ ویب سائٹ کو روزانہ ایڈیٹ (Edit) کیا جاتا ہے اور آسٹریلیا، امریکہ، انگلینڈ اور سعودی عرب جیسے مختلف ممالک سے ویب سائٹ پر آنے والوں کی تعداد تقریباً 1765000 سے زائد ہے، یہ کامیابی کی ایک بڑی دلیل ہے۔

نشریات:

ریڈیو اسلام کی نشریات خالص دینی و اسلامی مضامین پر مشتمل اور حالات کے اعتبار سے نہایت ہی مناسب وموزوں ہوتی ہیں۔ رمضان المبارک میں خصوصی نشریات کا اہتمام کیا جاتا ہے اور رمضان کوئز، تفسیر قرآن، تاریخ اسلام، کہانیاں، تقریری مقابلے اور تلاوتِ قرآن جیسے خوب صورت ودل کش پروگرام نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ حج کے موقع پر حاجیوں کے لیے خصوصی پروگرام اور نشریات نہایت ہی دل چسپ ہوتی ہیں، اسی طرح حج کے دن بھی خصوصی نشریات کا اہتمام کیا جاتا ہے، جو سامعین کے لیے نہ صرف دل چسپ اور معلوماتی ہوتی ہیں، بل کہ انتہائی مفید وکار آمد بھی ہوتی ہیں۔

ویب سائٹ:

ریڈیو اسلام کی ویب سائٹ بھی انتہائی مقبول ہے، جو تقریباً سو سے زائد ممالک میں دیکھی و پڑھی جارہی ہے۔ اسلامی پیغامات کے فروغ میں ریڈیو اسلام کی ویب سائٹ کا بھی اہم کردار ہے، منتظمین کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ ویب سائٹ کو ہمیشہ تازہ ترین معلومات سے مزین رکھا جائے؛ تاکہ ویب سائٹ پر آنے والے لوگوں کو اسلامی، تعلیمی اور اصلاحی مضامین فراہم کیا جاسکے، ریڈیو اسلام کے سامعین کے تبصرے اور مشورے بھی نہایت حوصلہ افزا ہوتے ہیں، جو ریڈیو اسلام کی ترقی میں مدد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔

ریڈیو اسلام کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی ہے کہ وہ اپنے سامعین کو خوش اور مطمئن رکھے اور اُن کی ضرورتوں اور مطالبوں کے مطابق پروگرام نشر کیے جائیں؛ تاکہ سامعین کے لیے دل چسپی کا باعث اور مفید ہوں؛ کیوں کہ یہ معیاری خدمات فراہم کرنے کے لیے اِس بات سے واقف ہونا ضروری ہے کہ سامعین کے لیے کیا چیزیں اہم ہیں اور کیا چیزیں مناسب نہیں ہیں، سامعین کی شکایتوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ سننا اور انہیں دور کرنا بھی ریڈیو اسلام کو معیاری بنانے میں معاون ہے۔

سماجی خدمات:

نشریاتی پروگرام کے علاوہ ریڈیو اسلام سماجی خدمات میں دل چسپی رکھتا ہے۔

کتابیں، کپڑے اور چشمے وغیرہ محتاج بچوں اور لوگوں کو فراہم کرنے میں بہت اہم رول ادا کررہا ہے۔ ریڈیو اسلام کی ہیلپ لائن بھی لوگوں کے لیے نہایت مفید ہے۔ موبائل کلینک کے ذریعے ریڈیو اسلام محتاجوں اور ضرورت مندوں تک طبی خدمات کی فراہمی کے ساتھ اس اہم سماجی کاموں میں بھی سرگرم عمل ہے۔

خبرنامہ:

ریڈیو اسلام کی اہم نشریات میں سے خبرنامہ بھی ہے، خبرنامے اور حقیقت پر مبنی تجزیے ریڈیو اسلام کی مقبولیت میں زبردست اضافہ کررہے ہیں۔ خبرناموں کے ساتھ مقامی موسم کی رپورٹ بھی شامل ہوتی ہے؛ علاوہ ازیں ریڈیو اسلام اپنے سامعین کو اسلامی اور عالمی مسائل سے بھی باخبر رکھتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہم ریڈیو اسلام کو مختلف النوع پروگراموں کا ایسا عکس کہہ سکتے ہیں جو موجودہ دور میں مسلم معاشرے کی ایک آواز بن چکا ہے۔

ریڈیو اسلام مندرجۂ ذیل تنظیموں کا ممبر بھی ہے:

☆......نیشنل ایسوسی ایشن آف براڈکاسٹر۔

☆......ساؤتھ افریقہ ایڈورٹائزنگ بیورو۔

☆......نیشنل کمیونٹی ریڈیو فورم۔

ریڈیو اسلام بڑی پابندی کے ساتھ درج بالا تنظیموں کی میٹنگوں میں شرکت کرتا ہے۔

بہر حال! ریڈیو اسلام تقریباً ۲۵؍سالوں سے ذرائع ابلاغ کے اس اہم دور میں اپنے وسائل کے ساتھ اہم خدمات انجام دے رہا ہے، جو ہم جیسوں کے لیے ایک راہ نما اور مشعل راہ ہے، اس کے لیے ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا چاہیے اور دعا کرنا چاہیے کہ آنے والے اس مقابلاتی دور میں ریڈیو اسلام کو مزید کامیاب بنائے اور مسلمانوں کی ایک مضبوط آواز بنائے۔ آمین یارب العالمین!

ریڈیو اسلام کی ملاقات:

ریڈیو اسلام کا تعارف اس سے قبل کیا گیا، اب ریڈیو اسلام کی ملاقات کے بارے میں کچھ باتیں، اس لیے کہ دوسرے سفر کا مقصد ہی ریڈیو اسلام کی ملاقات اور اس کے طریقۂ کار کو دیکھنا تھا تاکہ اسی طرز پر ہندوستان میں بھی ریڈیو شروع کیا جائے۔

اس سے قبل بندہ عرض کرچکا ہے کہ جنوبی افریقہ کے پہلے سفر سے واپسی کے بعد حاجی عبدالقادر فضلانی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے سفر کی خاص بات دریافت کی تو بندے نے کہا کہ سفر کی خاص بات جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کی دین داری اور اس کی دو وجوہات ہیں: ایک ریڈیو اسلام کا مؤثر کردار، دوسرا مکاتب کا منظّم نظام تو حاجی صاحب نے کہا کہ ہندوستان میں بھی ریڈیو اسلام جاری کیا جائے اور اس کے لیے چند ماہرین افراد پر مشتمل وفد کو آپ لے کر جائیں۔ بندے نے حاجی صاحب کی بات کی تائید کی اور مندرجۂ ذیل افراد پر مشتمل ایک وفد جنوبی افریقہ کے لیے روانہ ہوا۔

۱	امتیاز خلیل	بطور صحافی اور میڈیا میں کام کا عمدہ تجربہ رکھنے کی حیثیت سے۔
۲	بلال بھائی	I.T میں مہارت کی وجہ سے رفیقِ سفر۔
۳	مفتی اشفاق صاحب	جامع مسجد ممبئی، حلال ادارے کی معلومات کے لیے۔
۴	مولانا عبدالحسیب صاحب	ایک عالم کی حیثیت سے۔
۵	خود احقر (حذیفہ وستانوی)	

ریڈیو اسلام میں سب سے پہلے مولانا حیدر علی دھورات سے ملاقات ہوئی، موصوف ریڈیو اسلام کے اسٹیشن منیجر ہیں، آپ نے پرتپاک استقبال کیا اور ریڈیو اسلام کے تمام ذمہ داروں سے تعارف کروایا، اس کے بعد مولانا سلیمان راوت صاحب کے پاس گئے۔ مولانا ریڈیو اسلام کے روحِ رواں اور جان ہیں، آپ اپنے انگریزی طرزِ تکلم اور اخبارات پر عمدہ تبصرہ و تجزیہ کے لیے بڑے مقبول و معروف ہیں، مولانا کے ایک پروگرام کا وقت ہو رہا تھا؛ لہٰذا ہم سب وہاں بیٹھے رہے، تاکہ مولانا کے پروگرام کو دیکھیں۔ ماشاء اللہ مولانا سلیمان راوت صاحب نے بہت عمدہ انداز میں پروگرام پیش کیا اور بہت کچھ سیکھنے کو ملا، اللہ تعالیٰ مولانا کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

اس کے بعد فضیل پٹیل صاحب سے ملاقات ہوئی، جو ریڈیو اخبارات نشر کرتے ہیں، ماشاء اللہ آپ بھی بڑے دل فریب انداز میں اخبار ریڈیو پر پیش کرتے ہیں اور کسی ایک ٹوپک کو لے کر ۲ر منٹ دل چسپ انداز میں اس پر تجزیہ پیش کرتے ہیں، اس دن ٹرافک پر آپ کا تجزیہ تھا۔

دوپہر کا کھانا مفتی صہیب صاحب کے یہاں تھا، موصوف نے پرتکلف دعوت کی، ریڈیو اسلام کے دفتر سے لگ کر آپ رہائش پذیر ہیں۔

کھانے کے بعد مولانا حیدر علی، مولانا سلیمان راوت وغیرہ کے ساتھ تفصیلی نشست ہوئی، جس میں مولانا حیدر صاحب نے تفصیل سے یہ بتانے کی کوشش کی کہ ریڈیو اسلام کا آغاز کس طرح ہوا اور آغاز میں کس طرح بعض علما نے شدید مخالفت کی اور آج تک کرتے چلے آ رہے ہیں۔ مولانا نے کہا کہ شدید مخالفت کے بعد اس وقت اکابرین سے ہم نے فتاویٰ لیے اور اسلام کا نقطۂ نظر معلوم کیا، جن میں مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئیؒ، مفتی محمود صاحبؒ، مولانا تقی عثمانی صاحب اور دیگر کبار علمائے برصغیر شامل ہیں، سب نے جواز فراہم کیا، بل کہ سراہا اور مستحسن قرار دیا، اکابرین کی تائید کے بعد ہمیں مزید اطمینان ہو گیا اور ہم نے اپنے مشن کو آگے بڑھایا۔

ریڈیو اسلام کی ترقی کے بعد بعض مرتبہ مشکل حالات بھی آئے، مگر ہم نے حکمت اور جرأت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور الحمدللہ! قدم آگے بڑھاتے رہے۔

مولانا حیدر علی صاحب کے بعد موجودہ حالات پر مولانا سلیمان راوت صاحب نے گفتگو کا آغاز کیا اور کمپیوٹر کی مدد سے ریڈیو اسلام کا پرزنٹیشن پیش کیا؛ جس میں بیان کرنے کی کوشش کی کہ ہم نے کس طرح حکومتِ جنوبی افریقہ سے ریڈیو اسلام کی منظوری حاصل کی، ابتدائی مرحلہ میں ٹاورس نصب کیے گئے، کہاں کہاں نصب کیے گئے وغیرہ! ٹاورس کے ذریعہ مختصر علاقے تک پیغام پہنچ پاتا تھا،

اس کے بعد جیسے جیسے ریڈیو سسٹم میں ترقی ہوتی رہی، ہم بھی ان ترقیات کو اپنے سسٹم میں لاتے رہے آج الحمدللہ! سیٹلائٹ کے ذریعے بھی ہم دنیا کے دسیوں ممالک میں ریڈیو اسلام کا پیغام پہنچارہے ہیں؛ بل کہ اب تو ویب سائٹ اور موبائل اپلیکشن بھی تیار ہوچکی ہے اور روزانہ لاکھوں افراد اس سے استفادہ کررہے ہیں۔ آپ آج بھی www.radioislam.co.za پر جاکر ریڈیو اسلام کی تمام نشریات کو سن سکتے ہیں۔ اسی طرح Radioislam لکھ کر اس کا اپلیکیشن اپنے موبائل میں ڈاؤن لوڈ کرسکتے ہیں اور افریقی ممالک میں MW1548 جاکر اسے ریڈیو سے براہ راست سن سکتے ہیں؛ غرض یہ کہ ریڈیو اسلام کی پوری ٹیم قابلِ مبارک باد ہے کہ وہ پوری تندہی کے ساتھ ریڈیو اسلام کے ذریعے دنیا کے مختلف ممالک میں اسلام کا پیغام انگریزی میں نشر کررہے ہیں، یہ بھی گویا دعوت الی اللہ کا ایک اہم ترین ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور امت کو اس سے خوب دینی ودنیوی نفع پہنچائے۔

مولانا سلیمان راوت صاحب اور دیگر احباب نے تقریباً دو گھنٹے تک ساری تفصیلات بیان کیں، اس کے بعد ریڈیو اسلام پر نشر شدہ تمام پروگرام ہماری ہارڈ ڈسک میں انہوں نے دے دیا کہ آپ اگر ہندوستان سے ریڈیو اسلام کی نشریات شروع کریں تو اس سے استفادہ کرسکتے ہیں، ان کی اس فراخ دلی پر ہم ان کے ممنون ومشکور ہیں۔

ریڈیو اسلام کی تمام نشریات انگریزی ہوتی ہیں؛ البتہ افریقہ میں بہت سے افراد اردو سے دلچسپی رکھتے ہیں، لہٰذا ہفتہ میں ایک پروگرام اردو میں بھی نشر کیا جاتا ہے، مولانا حیدر صاحب نے اردو نشریات کے لیے بندے سے کہا کہ آپ کا انٹرویو اور جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کے نام آپ کا پیغام ہم نشر کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا آپ تشریف لے جاکر ریکارڈ کروالیں، بندہ مولانا کے اصرار پر آمادہ ہوگیا اور تقریباً ایک گھنٹہ کے لیے کافی مواد ریکارڈ کروایا، اس ذرہ نوازی پر بندہ ریڈیو اسلام کا ممنون ومشکور ہے۔

بہر حال ہم نے دن بھر ریڈیو اسلام کا تفصیلی جائزہ لیا، اس کے بعد ہم نے ریڈیو اسلام سے چل کر ایک مرکز کا معاینہ کیا جہاں مسلمانوں کے آپسی تنازعات کو سلجھایا جاتا ہے۔ ماشاءاللہ! اس کا بھی عمدہ نظام ہے، عورتوں اور مردوں کے لیے علاحدہ علاحدہ انتظامات ہیں، اس کے بعد ہم نے وہیں قریب واقع ایک اسلامی اسکول کا معاینہ کیا، ماشاءاللہ! وہاں بھی اسکول کا عمدہ نظام اور مکتب کی شکل میں دینی تعلیم کا بھی بہترین نظام ہے، وہاں بچوں کو شروع ہی سے انگریزی میں دینی تعلیم دی جاتی ہے؛ کیوں کہ وہاں کی مادری زبان مسلمانوں کی بھی انگریزی ہے؛ لہٰذا وہ بہت آسانی سے دین کو سمجھ لیتے ہیں۔ ہمارے ہندوستان میں مکاتب کی تعلیم میں مادری زبان کا اتنا لحاظ نہیں، بچہ پہلے اردو سیکھتا ہے، پھر دین سمجھتا ہے، وہاں تک کافی دیر ہوچکی ہوتی ہے؛ لہٰذا اس کامیاب تجربہ کو ہمارے ہندوستان کے مکاتب میں رائج کرنے کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد ہم ''جمعیۃ علما'' کے میڈیا سینٹر پہنچے، جہاں مختلف اسلامی موضوعات کی کتابیں اور سی ڈیاں موجود تھیں، ائمۂ مساجد کو ہر جمعہ خطبات وہاں سے تیار کر کے دیے جاتے ہیں، مختلف مناسبتوں سے علما کے بیانات کا انتظام کیا جاتا ہے اور دیگر نشر و اشاعت کے کام بڑے عمدہ سلیقے سے کیے جاتے ہیں۔

اس کے بعد ہم ''سنہا''، یعنی جنوبی افریقہ میں حلال اشیا کا تحقیقی ادارہ جس کا مکمل نام South African National Halal Authority ہے۔ عربی میں ''الهيئة الوطنية لتوثيق الحلال بجنوب أفريقا'' کی معلومات حاصل کرنے کے لیے پہنچے۔ ماشاء اللہ! بہت مرتب نظام ہے اور افریقی ممالک میں اسے بڑا اثر و رسوخ حاصل ہے، اس کی مزید تفصیلات آپ www.sanha.org.za پر دیکھ سکتے ہیں۔ افریقی مسلمان اس کی تصدیق کے بغیر نہ ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں، نہ کوئی کھانے کی چیز استعمال کرتے ہیں، میں جب موزمبیق سے دبئی جانے لگا تو افریقا ایرلائنس میں مجھے کفنی ٹوپی میں دیکھ کر فوراً کھانے پر سنہا کا سکہ بتلایا کہ بھائی یہ حلال مصدقہ کھانا ہے، واقعتاً مجھے بہت مسرت محسوس ہوئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جنوبی افریقا کے علما نے ماشاء اللہ! ہر میدان میں امتِ مسلمہ کی رہبری کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات قبول فرمائے اور ان کے لیے باعث نجات بنائے۔

مدرسۃ النور (برائے نابینا طلبہ):

جنوبی افریقہ کے دوسرے سفر میں ہم نے جب ''پیٹر میرٹز برگ'' کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہاں ''مدرسة النور للمكفوفين'' (Mdadrsa Al-Noor for The Blind) ہے، جو نابینا طلبہ کے لیے خاص ہے، جس کو مولانا مرچی صاحب نے بنایا ہے، اور مولانا مرچی ہمارے والد کے خاص دوستوں میں سے ہیں، تو ساتھیوں نے کہا کہ چلو اس کی زیارت کرتے ہیں۔ ہمارے چچازاد بھائی سلیم یعقوب رندیرا کے ساتھ ہم وہاں پہنچے، مولانا مرچی صاحب دامت برکاتہم ہندوستان کے دورے پر تھے، لہٰذا ملاقات نہ ہو سکی؛ البتہ دیگر ذمہ دار احباب نے مدرسہ کی زیارت کروائی، واقعتاً یہ ادارہ بھی اپنی نوعیت کا ایک منفرد اور بے مثال عالمی ادارہ ہے جو آنکھوں سے معذور اور بینائی سے محروم نونہالانِ امت کو تعلیم سے آراستہ کر رہا ہے۔

''مدرسۃ النور'' کا آغاز ۱۹۸۶ء میں ''پیٹر میرٹز برگ'' شہر میں ایک چھوٹے سے کمرے میں ہوا، جس میں اولاً نابینا طلبہ کو بریل (نابیناؤں کی مخصوص کتاب) میں نورانی قاعدہ اور بنیادی تعلیم دی گئی، ایک طالب علم اور ایک استاذ سے اس کا آغاز ہوا۔

مولانا مرچی صاحب نے جب دیکھا کہ مسلم نابینا افراد معاشرے پر بوجھ ہورہے ہیں، کیوں کہ ان کی تعلیم کا کوئی نظم نہیں اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں نے اس کا اہتمام شروع کردیا تھا، مگر مسلمان نابینا بچوں کے لیے اسلامی تعلیم کا کوئی نظام نہیں ہے تو آپ نے اللہ کا نام لے کر یہ بیڑا اپنے سر لیا۔ اس زمانہ میں ساؤتھ افریقہ میں خاص طور پر عبقریت یعنی ذات پات کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، کیوں کہ سفید فاموں کی حکومت تھی اور وہ ایسی چیزوں کو خوب ہوا دے رہے تھے، اس طرح ١٩٨٦ء میں آغاز کے بعد مختصر عرصے میں طلبہ کی تعداد ٣ ہوگئی اور ماشاء اللہ صرف ایک سال کی مدت میں وہ طلبہ بیریل پر انگلیوں کے سہارے قرآنِ کریم کی تلاوت پر قادر ہوگئے اور دوسرے ہی سال انہوں نے حفظ بھی شروع کردیا۔

آہستہ آہستہ طلبہ کی تعداد بڑھنے لگی اور دنیا کے مختلف ملکوں سے اچھی خاصی تعداد میں نابینا طلبہ یہاں آنے لگے؛ مگر جگہ کی تنگی کی بنا پر مدرسہ شہر سے باہر وسیع وعریض جگہ پر منتقل کردیا گیا۔

١٥ سال کے بعد یعنی ١٩٩٩-٢٠٠٠ میں جب مدرسہ وسیع جگہ پر منتقل ہوا تو اب وہاں بریل میں طباعت کے لے جو آلات لگتے تھے وہ بھی خریدے گئے اور نابینا بچوں کے لیے ''صوتی ریکارڈ'' کی گئی کیسٹوں کو ڈاک کے ذریعہ دنیا کے مختلف ملکوں میں ارسال کیا گیا۔

مولانا مرچی ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''ہمارے لیے سب سے بڑا چیلنج تھا حدیث، فقہ، تفسیر، نحو وصرف وغیرہ کی کتابوں کو بیریل میں منتقل کرنا؛ مگر الحمد للہ! ہم کامیاب ہوئے، ایک طرف بیریل میں درسی کتابیں تیار ہوتی رہیں اور دوسری جانب نابینا طلبہ دینی تعلیم کے میدان میں آگے بڑھتے رہے، یہاں تک کہ ٢٠٠٤ء میں ایک نابینا بچی اور ایک لڑکے نے صحاح ستہ اور دیگر درسِ نظامی کتابیں پڑھ کر شہادۃ الفضیلۃ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

''مدرستہ النور'' کو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دنیا کے مختلف خطوں میں مقبولیت حاصل ہونے لگی اور اس کے طرز پر دیگر ملکوں میں ادارے قائم کئے گئے۔

خلاصہ یہ کہ ''مدرستہ النور'' ایک عالمی ادارہ ہے، جو معذور اور نابینا افراد کی تعلیم کے لیے کامیاب خدمات انجام دے رہا ہے۔

اس طرح تقریباً جنوبی افریقہ کے سفر کی روداد پوری ہوئی، اب جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کے لیے چند تجاویز اور مشورے قلم بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

پیغام! مسلمانانِ جنوبی افریقہ کے نام:

چھوٹا منہ بڑی بات! میں اپنی علمی بے بضاعتی کا اعتراف کرتا ہوں اور اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ کسی کو نصیحت کروں، پھر بھی قندِ مکرر کے طور پر چند تجاویز پیش کرنے کی جسارت کررہا ہوں۔

ع ''شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات''۔

میں نے ایک سال کے دورانیہ میں جنوبی افریقہ کے مدارس، جامعات، مساجد اور دینی ونشریاتی اداروں کی زیارت کی اور مسلمانانِ جنوبی افریقہ کو بہت قریب سے دیکھا، جس کی تفصیلات کو سابقہ صفحات میں ذکر کر چکا ہوں۔ تو آیئے! اب اخیر میں آپ کو بہ طورِ تجاویز چند امور کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا، اللہ مجھے صحیح لکھنے اور ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

۱- سب سے پہلے تو آپ کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ نے آپ کے آباء واجداد کے ذریعے اسلام اُس ملک میں پہنچایا، جہاں انگریز آپ کے آبا واجداد کو ہندوستان اور انڈونیشیا سے غلام بنا کر لائے تھے؛ مگر اللہ کا فضلِ خاص آپ کے ساتھ شاملِ حال رہا اور ڈھائی تین سو سال بعد بھی اسلام اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ آپ حضرات کے درمیان موجود ہے۔ اس پر مستزاد اللہ نے آپ کے آباء واجداد کی دین داری کی برکت سے آپ حضرات کو مال ودولت سے نوازا، اس طرح آپ لوگ **”وکان أبوهما صالحا“** کی جیتی جاگتی تصویر بنے ہوئے ہو۔ گویا اللہ نے آپ کو حسنۂ دنیا بھی عطا فرمایا اور تمسک بالدین کی وجہ سے حسنۂ آخرت کی بھی قوی امید ہے، آپ لوگ اس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔ **لئن شکرتم لأزیدنکم!**

۲- آپ اپنے نیک اور صالح آبا واجداد اور علما کو بھی فراموش نہ کریں، جنہوں نے پوری قربانیاں دے کر اسلام کو اپنی نسلوں میں زندہ رکھنے کی بھرپور کوشش کی، جس کی برکت سے آپ اسلامی تشخص کے ساتھ اس دیارِ غیر میں سکونت پذیر ہیں۔

۳- اس میں کوئی دورائے نہیں کہ یورپ کی ظالم اقوام نے نسل پرستی کی بنیاد پر یہاں کے اصل باشندوں کو اسلام سے دور رکھنے کی بھرپور کوشش کی، سفید فام انگریزوں کے دور میں نسلی بنیاد پر انہوں نے لوگوں کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا، رہائش اور بود وباش وغیرہ کے لیے سفید فاموں کے علاقے الگ ہوتے تھے، سیاہ فام اصل افریقی باشندوں کے علاقے الگ ہوتے اور ایشیائی مسلمانوں کے لیے کچھ علاقے مخصوص رکھے گئے تھے، ان کے اس طرزِ عمل سے دو پہلو سامنے آئے، ایک ایجابی اور دوسرا سلبی۔

ایجابی پہلو تو یہ تھا کہ مسلمانوں کی اپنی نسلوں میں اسلام مکمل طور پر محفوظ رہا، اس لیے کہ جب اغیار سے خلط ملط نہیں ہوا تو مسلمان نسلیں ان کے عادات اور اطوار وافکار سے متاثر نہ ہو سکیں۔

اور سلبی پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں اور افریقی باشندوں کا آپس میں اختلاط نہ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ اسلام سے متعارف نہیں ہو سکے۔

۴- احقر نے اور احقر سے پہلے جن عرب وعجم علما نے بھی جنوبی افریقہ پر اپنے تاثرات یا سفرنامے لکھے، انہوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کو سیاہ فام اصل باشندوں تک دعوتِ اسلام پہنچانے میں جیسی محنت کرنی چاہیے تھی، ویسی محنت نہیں کی۔ اگر وہ ان پر کچھ محنت کر لیتے تو اس کے اثرات آج کچھ اور ہوتے؛

اس لیے کہ سیاہ فام اقوام ایک جانب غربت کا شکار ہے اور دوسری جانب سادہ لوح اور نرم خو ہے۔ جس کی وجہ سے وہ تیزی کے ساتھ اسلامی تعلیمات سے متأثر ہو جاتے اور جہاں آج مسلمانوں کا تناسب ۲/فی صد ہے وہ ۲ کے بجائے کم از کم ۲۰/فی صد ہوتا۔

جنوبی افریقہ کے مسلمان باشندوں کو معلوم ہونا چاہیے، دعوت الی الاسلام کا فریضہ ہر مسلمان پر عائد ہوتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿كنتم خير أمة اخرجت للناس﴾ تم بہترین امت ہو، جن کو لوگوں کی نفع رسانی کے لیے دنیا میں اللہ نے پیدا کیا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیا ہیں، اب قیامت تک نبوت کی ذمہ داری امتِ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذمے رہے گی۔

ماشاء اللہ آپ حضرات کو اللہ نے مال و دولت اور اثر و رسوخ دیا ہے، آج بھی ایک اندازے کے مطابق مسلمان اگر چہ دو فی صد ہیں، مگر تجارت و معیشت پر اُن کی گرفت ۷۰/۸۰/ فی صد کے قریب ہے تو آپ کیا نہیں کر سکتے ؟!! آپ حضرات تالیفِ قلب اور حسنِ اخلاق کے ذریعہ ان کو اپنا گرویدہ کر سکتے تھے اور ابھی بھی موقع ہاتھ سے نہیں گیا ہے، اگر اپنی ذمے داری کو سمجھیں اور اللہ کے حضور پیشی کا خوف کھائیں۔

لہٰذا اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا کریں اور ان سیاہ فام لوگوں میں اپنے دعوت کے مشن کو شروع کریں، یہ آپ کے یہاں کام کرتے ہیں ان کے ساتھ حسنِ سلوک کریں، ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں، تجارت میں امانت داری کا ثبوت دیں،

108

ان سے کم نفع لے کر ان کے دل جیتیں۔ زمانۂ قدیم میں ایک ایک مسلمان تجارت کے راستے سے پورے پورے ملک کے اسلام میں داخل ہونے کا ذریعہ بنتا تھا، آپ تو دسیوں ہزار کی تعداد میں ہیں تو کیوں آپ ایسا نہیں کر سکتے ؟؟؟

۵- مسلمان علما اور عوام آپس میں اتحاد و اتفاق کو برقرار رکھنے کی کوشش کریں اور اختلاف سے گریز کریں، اس لیے کہ علما میں اختلاف کے آثار نظر آ رہے ہیں، قبل اس کے کہ یہ شدت اختیار کرے اس کا سدِ باب ضروری ہے۔

۶- جنوبی افریقہ میں ہمارے ہندوستانی مسلمانوں کے گھروں میں بے شمار قرآنِ کریم کے حفاظ ہیں، مگر ان میں دو کمیاں ہیں: ایک تو اکثریت کا قرآن پختہ نہیں ہے اور دوسرا فہمِ قرآن نہیں ہے؛ لہٰذا اس چیز کی طرف توجہ دی جائے کہ حفظ میں پختگی کیسے پیدا ہو؟ ہمارے جامعہ میں اس کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ حفظ کے بعد حفاظ طلبہ کے درمیان باہم پانچ پانچ پاروں کے ۶/ مسابقات سال کے آخر میں وقفے وقفے سے رکھے جاتے ہیں، جس میں حفظ مکمل کرنے والے تمام طلبہ کی شرکت لازم ہوتی ہے اور ان ۶/ مسابقات میں کم از کم ۶۰/ فی صد نمبر حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے؛ ورنہ حفظ کی سند نہیں دی جاتی۔

فہمِ قرآن کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے؛ کیوں کہ اکثریت صرف حفظ پر اکتفا کرتے ہیں اور ایک حافظِ قرآن کو جس طرح اپنی اور اپنے اہلِ خانہ کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے، وہ قرآن کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ویسی فکر نہیں کر پاتے (انڈر اسٹینڈ لرنگ قرآن اکیڈمی کے ذمے دار ڈاکٹر عبد العزیز سے رابطہ کر کے اس سلسلے میں قدم اٹھایا جا سکتا ہے)۔

۷- ویسے تو الحمدللہ! جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کی دینی حالت دیگر ممالک میں مقیم مسلمانوں کے مقابلے میں بہت اچھی ہے؛ مگر موبائل کے عام ہونے کی وجہ سے اب نئی نسل تیزی سے بے راہ روی کی طرف بڑھ رہی ہے؛ لہٰذا علما اور والدین کو اس کی فکر کرنے کی ضرورت ہے کہ ان میں دینی جذبہ اور اسلامی حمیت کس طرح سے بڑھائی جائے؛ اگر چہ ریڈیو اسلام وغیرہ ذرائعِ ابلاغ اِس کوشش میں لگے ہوئے ہیں، مگر وہ ناکافی ہیں۔ گھروں میں ماحول کو اسلامی بنانے پر کافی توجہ کی ضرورت ہے، اس لیے کہ نوجوان فیشن پرستی کی طرف جارہا ہے، جو خطرے کی گھنٹی ہے، اس کے لیے ذمہ دار حضرات مساجد اور اسکولوں میں عقائد، عبادات، معاشرت، معیشت وغیرہ پر مشتمل مختصر دورانیے کے ورک شاپ رکھ کر پروجیکٹر وغیرہ کے ذریعے مؤثر انداز میں اسلامی تعلیمات کو پیش کریں؛ تاکہ ہماری نسلِ نو اسلامی تعلیمات پر ثابت قدم رہے۔

۸- مدارس میں عربی زبان کے سکھانے پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے؛ تاکہ ہمارے نئے فارغین براہِ راست عربی مصادر کی طرف رجوع کرسکیں۔ اس لیے کہ الحمدللہ! بڑے پیمانے پر عربی میں آج بھی اسلامی تعلیمات پر کام ہو رہا ہے، خاص طور پر حدیث، فقہ، تفسیر وغیرہ پر مختلف ویب سائٹس اور اپلیکیشن آچکے ہیں، ان سے استفادہ آسان ہوجائے؛ بل کہ انہیں یہ سکھایا جائے کہ وہ کس طرح انٹرنیٹ سے دینی راہ نمائی حاصل کرسکتے ہیں اور کس طرح کے احتیاط کی ضرورت ہے؟ (اس سلسلے میں ”**اللغة العربية للجميع**“ نامی ادارے کا مرتب کردہ کورس ”**اللغة العربية بين يديك**“ سے خاصی راہنمائی مل سکتی ہے)۔

۹- مدارس کے نصاب میں عصری تقاضوں کے پیشِ نظر چند ضروری مضامین کا اضافہ کرنے کی بھی ضرورت ہے؛ تاکہ طلبہ فراغت کے بعد مکمل اور منظّم انداز میں معاشرے پر اثر انداز ہوسکیں، وہ چند مضامین یہ ہیں:

(۱) الغزو الفكري (۲) المقاصد الشرعية (۳) تعارف الفرق والأديان الباطلة (۴) الاقتصاد الاسلامي المعاصر (۵) حاضر العالم الاسلامي (۶) تعارف الفلسفة الغربية (۷) أصول الدعوة (۸) أصول البحث والكتابة (۹) علوم القرآن (۱۰) تفسير الإعجاز العلمي (۱۱) قواعد الفقه (۱۲) فقه الخلاف.

اول الذکر یعنی ”**الغزو الفكري**“ کے لیے مولانا واضح رشید ندوی دامت برکاتہم کی کتاب ”**الغزو الفكري**“، اور شیخ عبدالرحمٰن حبنکہ المیدانی کا سلسلۂ اعداء الاسلام کا سیٹ اور الشیخ انور الجندی کی کتابیں کافی مفید ثابت ہوں گی۔

ثانی الذکر کے لیے نور الدین الخادمی، طاہر بن عاشور، شیخ الریسونی اور امامِ شاطبی اسی طرح شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی ”**حجة الله البالغة**“ سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

”**تعارف الفرق والأديان**“ پر دارالعلوم دیوبند سے شائع شدہ محاضرات اسی طرح ”**الفَرق بين الفِرَق**“ عبدالقاہر البغدادی کی، ”**الملل والنحل**“ شہرستانی کی ”**الموسوعة الميسرة في المذاهب والأديان المعاصرة**“ سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

’’الاقتصاد الإسلامي المعاصر‘‘ کے عنوان پر’’اسلام اور جدید معیشت وتجارت‘‘ از شیخ الاسلام مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم، اسی طرح آپ کے صاحبزادے مولانا عمران اشرف کی کتاب’’شرکت ومضاربت عصرِ حاضر میں‘‘ اسی طرح مولانا زبیر اشرف کی’’اسلامی قانونِ اجارہ عصرِ حاضر میں‘‘ اعجاز صمدانی کی کتابیں’’خاص طور پر غرر اور اس کی صورتیں، کمپنی کے شرعی احکام‘‘، صدیق الضریر کی کتابیں، فقہ اکیڈمی کی قراردادیں، اسی طرح منتخب نظام الفتاویٰ اور ہمارے یہاں سے شائع شدہ محقق ومدلل جدید مسائل وغیرہ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

’’حاضر العالم الإسلامي‘‘ پر ڈاکٹر جمیل مصری کی ’’حاضر العالم الإسلامي‘‘ اور شیخ عبدالرحمٰن حبنکہ کی’’الحضارة الإسلامية‘‘ وغیرہ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

’’فلسفۂ مغرب‘‘ کے رد کے لیے پروفیسر حسن عسکری کی کتاب’’جدیدیت کی گمراہیاں‘‘ مولانا علی میاں صاحبؒ کی’’اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش‘‘ اور’’ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين‘‘، شیخ عواجی کی’’ إنک علی الحق المبين‘‘ مولانا محمد احمد کی’’تعارفِ تہذیبِ مغرب اور فلسفۂ جدید‘‘ اور’’اسلام کا معاشرتی نظام‘‘ ڈاکٹر خالد علوی صاحب وغیرہ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

’’اصول الدعوۃ‘‘ کے لیے’’الأسس العلمية لمنهج الدعوة الإسلامية‘‘، عبدالرحیم بن محمد المغذوی کی’’منهاج الدعوة إلى الاسلام في العصر الحديث‘‘ مقداد یالجن وغیرہ کی کتابوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

’’أصول البحث والكتابة‘‘ کے سلسلے میں’’ ورقات في البحث والكتابة‘‘ عبدالحمید عبداللہ الہدامہ کی’’عربی، اسلامی علوم اور سوشل سائنسز میں تحقیق وتدوین کا طریقۂ کار‘‘ پروفیسر ڈاکٹر خالق داد ملک کی۔

’’ علوم القرآن‘‘ کے سلسلے میں مولانا محمد تقی صاحب کی’’ علوم القرآن‘‘ مناع القطان کی’’ علوم القرآن‘‘ صبحی الصالح کی’’ مباحث في علوم القرآن‘‘ وغیرہ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

’’تفسير الإعجاز العلمي‘‘ کے موضوع پر ڈاکٹر مرہف عبدالجبار سقا کی کتاب’’ التفسير والإعجاز العلمى في القرآن الكريم ضوابط وتطبيقات‘‘ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

’’ قواعد الفقه‘‘ کے سلسلے میں ’’معلمة القواعد الفقهية‘‘، ’’المجمع الفقهي الإسلامي‘‘ جدہ سے شائع شدہ ’’موسوعة القواعد الفقهية‘‘ محمد صدقی بن احمد البورنو وغیرہ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

’’فقه الخلاف ‘‘ کے سلسلے میں امام ابن تیمیہؒ کی’’ رفع الملام عن أئمة الأعلام‘‘۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور شیخ زکریا صاحبؒ کی اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۰- طلبہ اور عامۃ الناس کو اسلامی فرقوں میں اختلاف کی صورت میں راہِ اعتدال کیا ہو وہ بتلایا جائے، خاص طور پر عوام کو قادیانی، شیعہ، بہائیت کی حقیقت سے آگاہ کیا جائے۔ **تلک عشرۃ کاملۃ**

احقر نے جو کچھ مشاہدہ کیا اس کی روشنی میں وقت کے تقاضہ کے اعتبار سے مسلمانانِ جنوبی افریقہ کو جو چیلنجز درپیش ہیں، اس کا متوقع حل بتانے کی کوشش کی گئی، اللہ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق سے نوازے۔ آمین!

خلاصہ یہ کہ افریقہ کے مسلمانوں میں بہت سی خوبیاں ہیں جو دیگر غیر اسلامی تو کیا، اسلامی ملکوں میں مقیم مسلمانوں میں بھی نہیں کہ وہ صرف دو فی صد ہونے کے باوجود وہاں کے غیر اسلامی ماحول سے اور دنیا کے الحاد زدہ معاشرے سے متاثر نہیں اور دینی اعتبار سے کافی پختہ اور مضبوط ہیں۔ اللہ انہیں ہمیشہ اسلام پر ثابت قدم رکھے؛ البتہ گلوبلائزیشن کے اثرات سے نئی نسل کے متاثر ہونے کے خطرات ان کے سروں پر منڈلا رہے ہیں، جس کا کامیاب دفاع ان کے لیے ضروری ہے اور اس دفاع کے لیے تجاویز آپ کی خدمت میں پیش کی گئی ہیں، امید ہے کہ مسلمانانِ جنوبی افریقہ ان تجاویز پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں گے۔ اللہ توفیق سے نوازے اور اپنی نصرت اور تائید کو آپ کے ساتھ شاملِ حال رکھے۔

اخیر میں، میں ان احباب کا شکریہ ادا کرتا چلوں، جنہوں نے افریقہ کے سفر میں بندے کے ساتھ ذرہ نوازی کی، فہرست تو ان کی طویل ہے، مگر جن کے نام سرِ دست یاد ہیں وہ یہ ہیں:

۱- چچازاد بھائی سلیم یعقوب رندیرا؛ جو اپنی تمام تر مصروفیات کو چھوڑ کر دونوں مرتبہ اپنی گاڑی کے ساتھ بندے کے ساتھ رہے اور بندے کا قیام وطعام بھی اپنے گھر پر رکھا، اللہ انہیں دارین میں اس کا بہترین بدلہ عطا فرمائے۔ آمین!

۲- پھوپھی زاد بھائی عرفان ایوب پٹیل، جنہوں نے مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، یہاں تک کہ سفر کے اختتام پر بندے کو پڑوسی ملک موزمبق کے مپوٹو شہر میں مقیم مولانا نذیر صاحب کے گھر تک اپنی گاڑی سے پہنچایا۔ **فجزاہ اللہ خیراً في الدارین.**

۳- پھوپھی زاد بھائی اقبال محمد بھگت رندیرا (۴) پھوپھی زاد بھائی سلمان ایوب پٹیل (۵) جناب اسماعیل پولیس (۶) نور محمد حبیب اور عبد اللہ حبیب (۷) مولانا عبد اللہ بشیر باٹھیا، مولانا بشیر باٹھیا، دارالعلوم زکریا (۸) مولانا ظہیر راگی، مولانا سلیمان راوت، مولانا ابراہیم بھام، مولانا داؤد قاسم، مفتی صہیب، مولانا حیدر وغیرہ ریڈیو اسلام اور "جمعیۃ علمائے جنوبی افریقہ" کے تمام ذمہ دار (۹) اقبال جام بھولا، سہیل اسماعیل صوفی اور دیگر کرانس کوپ کے احباب (۱۰) دارالعلوم آزاد ویل کے ذمہ دار احباب (۱۱) "مدرسۃ النور للمکفوفین" کے ذمہ دار احباب (۱۲) والد صاحب کے دوستوں میں سولی انکل آزاد ویل، پاریکھ فیملی ڈربن یہ وہ اسما ہیں، جو ذہن پر زور دے کر تحریر کیے گئے ہیں، فی الوقت بہت سے احباب کے نام چھوٹ رہے ہوں گے بندہ اس پر معذرت چاہتا ہے۔

سفرنامہ لکھنے کے دوران جن احباب نے تعاون کیا ان کا بھی مشکور ہوں مثلاً:
۱- مولانا عبد اللہ باٹھیا صاحب ۲- مولانا شمس الہدیٰ صاحب ۳- مفتی اسماعیل کوثر صاحب ۴- مولانا ہلال الدین صاحب ۵- مولانا محمد سبحان صاحب وغیرہ کہ ان دوستوں کے تعاون سے یہ سفرنامہ قلم بند ہوسکا ورنہ بہ ظاہر ناممکنات میں سے تھا۔

اللہ ہمارے ان تمام احباب اور معاونین کو دنیا و آخرت میں اپنے خصوصی لطف وکرم اور فضل سے نوازے، سفرنامہ کو امت کے حق میں باعثِ نفع ٹھہرائے اور اللہ ہم سب سے راضی ہوجائے، ہر طرح کے فتنوں اور بیماریوں سے ہم سب کی حفاظت فرمائے اور دین کی خدمت اخلاص کے ساتھ انجام دینے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین!

کتابیات

(۱) المعجم الاشتقاقي الموصل لألفاظ القرآن الكريم
(۲) ابن ما جد والبرتغال
(۳) مسيرة الدعوة الإسلامية في أفريقية عبر التاريخ
(۴) الأقليات المسلم في أفريقيا
(۵) الأقلية المسلمة في دول جنوب أفريقيا
(۶) سبحة المرجان في آثار هندوستان
(۷) التصريح بما تواتر في نزول المسيح
(۸) مجموعة رسائل الكشميري
(۹) اسلاف کا طرز تحقیق مقالہ از اسماعیل ریحان
(۱۰) عالم اسلام وسائل ومسائل
(۱۱) دنیا مرے آگے

(۱۲) جہانِ دیدہ

(۱۳) مقدمۂ تاریخ گجرات

(۱۴) تاریخ فرشتہ

(۱۵) مذہب اور جدید چیلنج

(۱۶) عربی زبان وادب کی ترقی میں گجرات کے دانش وروں کا حصہ

(۱۷) یادِ ایام

(۱۸) گجرات کی تمدنی تاریخ

(۱۹) گلو بلائزیشن اور اسلام

(۲۰) عالم اسلام پر یہود ونصاریٰ کے ذرائع ابلاغ کی یلغار

(۲۱) سالانہ رپورٹ از دار العلوم آزادویل

(۲۲) سالانہ رپورٹ از جمعیۃ علمائے جنوبی افریقہ

(۲۳) www.thaqafaonlne.com

(۲۴) Nadialarab.com

(۲۵) Islamic History & civilisation in South Africa

☆......☆......☆

یادداشت

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....